ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

جون ۲۰۱۸ء | جلد ۹ | شمارہ ۱۲ | رمضان وشوال ۱۴۳۹ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9808850029
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپے
سالانہ:	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبر شپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبر شپ (۲۰ سال):	4000:00 روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	لغویات سے اجتناب کیجیے!	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	
۲۔	اداریہ	سقوط بیت المقدس	مدیر	۳
		گاندھی کو مہاتما بنانے والی مسلم یونیورسٹی اور کرناٹک انتخابات		۷
۴۔	خاص تحریر	سعودی عرب-یوسفی گر نہیں ممکن تو زلیخائی کر	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۱
۵۔	گوشۂ رمضان	ماہ رمضان کا قرآن کریم سے تعلق	ڈاکٹر محمد نجیب قاسمی سنبھلی	۱۸
۶۔	پیام عید	عیدالفطر-انعام واکرام کا دن	انیس الرحمٰن قاسمی	۲۱
۷۔	تذکرہ فاتحین	حضرت سعد بن ابی وقاصؓ	ترجمہ: محمد عالم ندوی	۲۵
۸۔	فقہی مباحث	بین مذہبی مذاکرات-اصول وآداب (آخری قسط)	محمد قمر الزماں ندوی	۳۹
۹۔	انکار حدیث	احمد امین کی رد کردہ بعض احادیث	محمد فرید حبیب ندوی	۴۵
۱۰۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد-چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۹
۱۱۔	اصلاح معاشرہ	شادی بیاہ کی غیر شرعی خرافات کا سدِّ باب کیسے ہو؟	سید احمد ومیض ندوی	۵۴
۱۲۔	نقطۂ نظر	کثیر جہتی تہذیب اور افکار سعید نورسی	ندیم احمد انصاری	۵۷
۱۳۔	تعارف و تبصرہ	رجب طیب اردوغان	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۶۱
۱۴۔	شعر و ادب	غزل	شعیب احسن اعظمی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

سقوط بیت المقدس

حرم کی سمت بھی جب صید افگنوں کی نگاھیں ھیں

۱۴ مئی ۲۰۱۸ء کی تاریخ یہود و نصاری کی ظالمانہ اور غاصبانہ ذہنیت نیز عربوں کی بزدلی اور بے بسی کے لیے ہمیشہ ایک سیاہ تاریخ کے طور پر یاد رکھی جائے گی، دسمبر ۲۰۱۷ء میں ٹرمپ نے اپنے سفارت خانہ کو شہر القدس (یروشلم) میں منتقل کرنے کا اعلان کیا تھا، درحقیقت یہ کھلا ہوا اعلان تھا کہ بیت المقدس پر امریکہ و اسرائیل کا قبضہ مکمل ہو گیا، تل ابیب میں دنیا بھر کے سفارت خانوں کا وجود اس بات کی گواہی ہے کہ فسلطین کا وہ حصہ اسرائیل کی ملکیت ہے، لیکن تل ابیب سے امریکی سفارت خانے کی مشرقی القدس میں منتقلی اس بات کا اعلان ہے کہ اب یہ حصہ بھی مسلمانوں کا نہ رہا، ٹرمپ نے یہ اعلان یوں ہی نہیں کیا تھا، بلکہ اس اعلان کے پیچھے اس کو سعودیہ و مصر اور امارات کے غلاموں کی رضامندی حاصل تھی، امریکہ و اسرائیل نے اتنا بڑا قدم یوں نہیں اٹھایا بلکہ عربوں کو ذہنی، فکری، مادی و اقتصادی اور پھر عسکری طور پر مادرزاد غلام بنا کر یہ قدم اٹھایا تھا، ٹرمپ کے اس اعلان کو سعودیہ و مصر اور امارات کی کس قدر تائید حاصل تھی اس کی دلیل وہ موتمر بن گئی تھی جو اسلامی تعاون تنظیم کے بینر تلے اردوغان کی دعوت پر ایمرجنسی میں منعقد کی گئی تھی، اس میں بعض ممالک نے اپنے سربراہان کے بجائے دینی امور کے وزیر کو بھیجنے پر اکتفا کی تھی، مسئلہ کی سنگینی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان ملکوں کے سربراہان نے اپنی شرکت کے بجائے اپنے نمائندوں کی شرکت کو کافی سمجھا تھا۔

اب دسمبر ۱۴ مئی کو امریکہ نے القدس میں اپنے سفارت خانے کا افتتاح کر دیا، دنیا بھر کے مسلمانوں کی غیرت پر منوں پانی پڑ گیا، عوام الناس کا حال دیکھیے تو صف ماتم بچھ گئی، مگر عرب حکمرانوں کا حال دیکھیے تو بے غیرتی بھی شرما جائے، فتح فاروقی کے بعد سے اب تک درمیان میں صرف ۹۰ سال کا عرصہ ایسا گزرا ہے جب بیت المقدس عیسائیوں کے قبضہ میں رہا، ورنہ ہمیشہ وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی، جب برطانیہ کو وہاں سے اپنی بساط لپیٹ کر جانا پڑا تو وہاں اس نے یہودیوں کی آبادی بسا دی اور آگے چل کر عربوں کے فریب اور ہوسِ اقتدار کی مدد سے ایک یہودی ریاست قائم کر دی، ۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک صرف فلسطینی قوم اور بالخصوص غزہ کے جیالے ہی ہیں جنہوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی مزاحمت سے غفلت نہیں برتی، وہ جانتے ہیں کہ ظالموں اور غاصبوں سے مقابلے کے لئے مجاہدانہ شان کی ضرورت ہے، عملا انھوں نے یہ کر کے بھی دکھایا ہے، جب امریکہ اپنے

سفارت خانے کا افتتاح کر رہا تھا تو غزہ کے ۳۵ ہزار سے زائد جیالے غزہ اسرائیل سرحد (جہاں تاروں کی کانٹے دار باڑھ ہے) پر القدس تک پہنچنے کے لئے مزاحمت کر رہے تھے، اپنی جدوجہد سے بے غیرت لوگوں کو غیرت دلا رہے تھے، ان عربوں کو للکار رہے تھے جن کا خون سفید ہو گیا ہے، انھیں پکار رہے تھے جن کے اجداد میں خالد بن الولید، عمرو بن العاص اور سعد بن ابی وقاص کا نام نامی آتا ہے، ان بے کسوں اور مظلوموں نے ہمیشہ اپنے خون سے تاریخ لکھی ہے اور آج بھی لکھ رہے ہیں، اس مزاحمت میں ۶۱ فلسطینی جام شہادت نوش کر گئے، ان شہیدوں میں بچے اور جوان سب ہیں، ۲۷ سو سے زائد افراد زخمی ہو گئے، ان زخمیوں میں مائیں، بیٹیاں، بہن بھائی اور باپ سب شامل ہیں، ان سب نے سینے پر زخم کھا کر یہ اعلان کیا کہ امت محمدؐ اپنے بے غیرت اور بدکردار حکمرانوں کے باوجود ابھی پسپائی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، انھوں نے اپنے دودھ پیتے بچوں کے ہاتھ میں پتھر دے کر یہ اعلان کیا کہ ہم انشاءاللہ رہتی دنیا تک ظالم و غاصب کے خلاف مزاحمت جاری رکھیں گے، ہم سلام کرتے ہیں ان نہتے فلسطینیوں کی شجاعت و جواں مردی کو اور اللہ تعالیٰ کے حضور ہاتھ پھیلا کر دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ اب رحم فرما دے، اے اللہ غزہ کے یہ بے بس و بے کس، کمزور و ناتواں نہتے و مظلوم بیمار و لاغر بوڑھے بچے اور عورتیں سب تیری رحمت کے منتظر ہیں، خدایا تیرے یہ بندے بدر و خندق کی تاریخ یاد رکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اس کا سبق دوہراتے ہیں، اے اللہ آپ بھی ان کی نصرت کے لئے اپنی رحمت کی بارش کر دیجئے، اے اللہ ہماری بداعمالیوں کی سزا انھیں نہ دیجئے، اے اللہ عربوں کے ذریعہ اسلام کی شبیہ کو مسخ کرنے اور دین محمدی کی جڑیں کھودنے کی سزا ان مظلوموں کو نہ دیجئے، اے رب کریم سقوط القدس امت محمد کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ اور اس کی بے غیرتی کی دلیل ہے مگر باری تعالیٰ عیش و عشرت میں ڈوبے ان بدکردار حکمرانوں کی بے غیرتی کی سزا ان بے چاروں کو نہ دیجئے جو اپنی جانوں اور اپنے نونہالوں کو تیری راہ میں قربان کرتے رہتے ہیں۔

تاریخ کا یہ بدترین و دلدوز واقعہ رونما ہوا، سوال یہ ہے کہ اس قدر جلدی کیوں ہوا؟ اور اب کیا ہونا چاہیے؟ جواباً عرض ہے کہ سقوط خلافت عثمانیہ، عرب و ترک قومیت کی تحریک اور اتاترک کے ذریعہ قومی غیرت اور اسلامی حمیت کی سرکوبی اس واقعہ کی تمہید تھی، آل سعود، جمال عبدالناصر، حافظ الاسد اور بشار الاسد کی حکومتیں اور پالیسیاں اس داستان ظلم کے ابواب تھے، ان کی ملمع کاریوں کا بھانڈا اب پھوٹ چکا تھا، تقدس کے پردے چاک ہو چکے تھے، جو کچھ ڈھکا چھپا تھا وہ سب واضح ہو گیا، عرصہ سے تیاری کی جا رہی تھی، اس داستان کا ہیرو محمد بن سلمان اب میدان میں دندنانے لگا تھا، اس کے ملک میں پہلے تو بدنام زمانہ صدر امریکہ کو بلا کر اعزاز و اکرام کیا گیا، اس پر عالم اسلام کی دولت نچھاور کی گئی، پوری مسلم دنیا کے سربراہوں کو اس کے ہاتھ پر بیعت کے لئے بلایا، پھر اسرائیل کے حق میں بیان بازیاں شروع کیں، تل ابیب کے لئے پروازوں کو اپنی فضائی حدود استعمال کرنے کی اجازت دے دی، ماڈریٹ اسلام یعنی امریکی و اسرائیلی اسلام کا نعرہ لگایا، سرزمین حجاز کے تقدس کو تار تار کرنے والے فیصلے صادر کیے، دینی رجحان کی سرکوبی کے لیے ایک طرف علمائے حق پر عرصہ حیات تنگ کیا تو دوسری طرف فحاشی و عریانیت کا بازار سجایا، فلمی اڈے کھول

دیے، نقاب کو غیر اسلامی تصور قرار دیا، غرض یہ کہ شہزادہ کچھ اس طرح بے لگام ہوا کہ اس نے عرصے سے عربوں کی امریکہ نوازی اور اسرائیل دوستی اور اسلام دشمنی کے تمام راز ہائے سربستہ کو طشت از بام کر دیا، جب صورت حال یہاں تک پہنچ گئی تو دشمنوں نے بھی اپنے عزم کا اعلان کر دیا، اس اعلان کے بعد ترکی کے صدر نے دوٹوک موقف اپنایا تو شہزادے نے ترکی کو ''شیطانی طاقت'' قرار دے ڈالا، امارات نے اس کے پرکھوں کا مذاق اڑایا، اس اعلان کے لیے ہی سرزمین شام پر اسلام کے نام لیواؤں کا پوری سفاکیت کے ساتھ خون بہایا گیا اور مصر میں محمد مرسی کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا، اس پوری کاروائی میں سعودیہ و امارات کا کردار انتہائی نمایاں اور انتہائی بدترین رہا، رجب طیب اردوغان نے مصر و شام کے عوامی انقلاب کی کھل کر حمایت کی، اس کی وجہ صاف تھی، اگر مصر و شام میں اسلام پسندوں کی حکومت قائم ہو جاتی تو بہت جلد ترکی انھیں معاشی استحکام کے ذریعہ اپنے پیروں پر کھڑا کر دیتا، جس کا اس نے بار بار اظہار بھی کیا تھا، پھر ان تینوں کا ترکی کی سربراہی میں ایک طاقت ور بلاک بن جاتا جو اسرائیل کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوتا، اور عرب جاگیردار بھی اپنا رویہ بدلنے پر مجبور ہوتے، یہی وجہ تھی کہ مصر و شام کو اسلام پسندوں کا مقتل بنا دیا گیا اور ترکی کو توڑنے کی ہر ممکن سازش رچی گئی مگر اللہ کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا کہ ترکی اب تک ہر سازش سے نکلنے میں کامیاب رہا ہے، اب جب کہ پلاٹ مکمل طور پر تیار ہو گیا تو القدس میں سفارت خانہ کی منتقلی کا اعلان کیا گیا، اور اس اعلان کے بعد سفارت خانہ منتقل کر کے یہ پیغام دے دیا گیا کہ تاریخ لاکھ ثبوت دے کہ القدس فلسطین کا دارالحکومت تھا اور ہے مگر امریکہ گواہی دے رہا ہے کہ القدس اب اسرائیل کی راجدھانی ہوگا۔

اس موقع پر دنیا کے کئی ممالک میں احتجاج ہوا، بعض یورپی ملکوں میں بھی احتجاجی مظاہرے ہوئے، دنیا بھر کے ستر ممالک کے عوام نے ۱۴ مئی کی شام کو سوشل میڈیا پر احتجاج درج کرایا، غزہ کے سپوت سینے کھول کر سامنے آ گئے، مگر مسلم حکمرانوں کو سانپ سونگھ گیا اور کیوں نہ سونگھ جاتا عرصہ سے وہ ان ہی کی چاکری کرتے رہے ہیں، ان ہی کے سہارے تخت اقتدار پر باقی ہیں، ان ہی کو آقا و مولیٰ سمجھتے ہیں، ان عقل سے کورے حکمرانوں نے نہ تاریخ کو پڑھا اور نہ تاریخ سے سبق لیا کہ امریکہ جس سے دوستی کرتا ہے اسے بالآخر تختہ دار پر لٹکا کر انجام تک پہنچاتا ہے، مقصد پورا ہونے کے بعد عام طور پر پٹھوؤں اور جاسوسوں کو موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے، اسی خطرے کے پیش نظر تو اردوغان نے ٹرمپ کے اعلان کے بعد اسلامی تعاون تنظیم کی ایمرجنسی میٹنگ میں کہا تھا کہ ''القدس ہمارے لیے خط احمر (سرخ لائن) ہے، اگر ہم القدس کی حفاظت نہ کر سکے تو مدینہ کی حفاظت ممکن نہ ہوگی اور اگر مدینہ نہ بچ سکا تو مکہ بھی محفوظ نہ رہ سکے گا'' یہ محض الفاظ نہ تھے بلکہ اس میٹنگ سے غیر حاضر رہنے والے حکمرانوں کے نکمے پن پر ایک گہرا وار تھا جسے سمجھنے والے سمجھ رہے تھے کہ جو لوگ فسلطین کی بندر بانٹ میں شریک رہے، جن کے متعلق خود اسرائیلی وزیر خارجہ نے اپنے بیان میں بتایا کہ ان سے ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں اور سفارت خانہ کی منتقلی کے فیصلے میں ان کی رضامندی شامل ہے، جو لوگ اہل غزہ کو مزاحمت سے باز رکھنے کی کوششیں کرتے ہیں اور جو اسلامی مزاحمتی تنظیم کو دہشت گرد کہتے ہیں وہی تو حرمین کے مجاور

ہیں، اس لیے حرمین کی حرمت وعظمت کا محافظ اب بس اللہ رب العزت ہے، تہذیبی وثقافتی طور پر تو پامالی کا مکمل سامان فراہم کر ہی دیا گیا ہے، اردوغان نے اس موقع پر جو کچھ کہا وہ ان کی بصیرت کا غماز ہے، علامہ شبلی نے صدی قبل یہی بات اپنی مشہور زمانہ نظم ''شہر آشوب اسلام'' میں ارشاد فرمائی تھی ۔

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کا آشیاں کب تک
جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

اس مرتبہ بھی ایک ہی شخص تڑپا، صرف اسی کی تڑپتی آواز کانوں سے ٹکرائی، مگر افسوس کہ عصبیت کی آگ میں جلنے بھننے والے اس کی تڑپ کو ڈھونگ قرار دیتے ہیں، عقل سے عاری یہ چاہتے ہیں کہ تنہا وہ شخص خودکش حملہ آور بن کر تل ابیب میں کود پڑے، ان بے چاروں کو نہ ترکی کے دستور کی مجبوری کا علم ہے اور نہ وہاں کے استبدادی سیکولرزم کا اور نہ ہی معاہدۂ لوزان کے نتیجہ میں عائد پابندیوں کا اور نہ مستقبل میں ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کے امکانات کا، وہ نہ ترکی کی اسٹراٹیجک مجبوریوں سے واقف ہیں اور نہ تمام مسلم ممالک کے نکمے پن اور ترکی کے تئیں معاندانہ رویے سے، اردوغان کو وراثت میں ''ترکی-اسرائیل اسٹراٹیجک شراکت داری'' ملی تھی، جسے اب وہ برابری کی سطح تک لا سکے ہیں، پہلے ترکی اسرائیل کے ساتھ ہوا کرتا تھا، لیکن اردوغان کے آنے کے بعد سے وہ ہمیشہ عالم اسلام، فلسطین اور حماس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے، جس کے کئی تاریخی شواہد ہیں، یہاں ان کے ذکر کا موقع نہیں، اس سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ اردوغانی اقتدار میں ترکی اس حد تک تبدیل ہو چکا ہے کہ عوامی رجحان کے دباؤ میں اسرائیل کی سب سے بڑی حلیف اور مؤید کمالی پارٹی نے بھی اس موقع پر اردوغان کی آواز میں آواز ملائی اور امریکہ و اسرائیل سے سفیر بلانے کا مطالبہ کیا، پارلیمانی بیان جاری کرنے میں وہ اردوغان کی پارٹی کے شانہ بشانہ کھڑی رہی، اردوغان برطانیہ کے دورہ پر تھے وہیں سے انھوں نے اعلان کیا کہ سقوط بیت المقدس ناقابل برداشت ہے، انھوں نے اسرائیل و امریکہ سے سفیر واپس بلا لیے، اسرائیلی سفیر کو ترکی چھوڑنے کے لئے کہہ دیا، بعد میں اسرائیل سے کونسلر کو بھی واپس بلا لیا، تمام زخمیوں کو فوری طور پر طبی امداد فراہم کرنے کا اعلان کیا، لیکن اسرائیلی نے ترک طیاروں کو اپنی زمین پر اترنے کی اجازت نہ دینے کا اعلان کر دیا، امید ہے کہ ترک اسرائیل تعلقات اب بہت دن قائم نہیں رہ سکیں گے اگرچہ گزشتہ ۱۲ سالوں میں وہ کبھی بھی بہت خوشگوار نہیں رہے، ترک صدر نے پارلیمنٹ کا خصوصی اجلاس طلب کیا اور پھر تین پارٹیوں کی جانب سے چند مطالبات پر مبنی مشترکہ بیان بھی جاری ہوا، انھوں نے پورے ملک میں تین روزہ سوگ منانے کا اعلان کیا اور جمعہ کے روز ملک گیر سطح پر احتجاجی مظاہروں کا اعلان کیا، اس کے علاوہ انھوں نے جمعہ کو ہی اسلامی تعاون تنظیم کا ہنگامی اجلاس بھی طلب کیا اور اقوام متحدہ کا خصوصی اجلاس بلانے کا مطالبہ کیا، اس میں کیا شک کہ اب بات ان تمام چیزوں سے آگے

بڑھ چکی ہے، یہ واضح ہو چکا کہ مسجد اقصیٰ اب عربوں کا خون چاہتی ہے، لوگ ان اقدامات کو محض اخلاقی ردعمل میں شمار کر رہے ہیں، لیکن جس طرح یہ مرد آہن گھیرے میں ہے اس کے پیش نظر ہم اس کی اس اخلاقی جرأت کو سلام پیش کرتے ہیں، اور لوگوں سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ اپنے محبوب آقاؤں سے اسی طرح کی اخلاقی جرأت کے اظہار کا مطالبہ کریں گے، کیا جس طرح کے اقدام کی توقع اور مطالبہ وہ اردوغان سے کرتے ہیں وہی مطالبہ وہ اپنے سیاسی اور ریالی آقاؤں سے کریں گے، کیا ان میں اتنی جرأت ہے کہ وہ اپنے آقاؤں سے کہیں کہ وہ سب جمعہ کے روز استنبول میں منعقد ہونے والی اسلامی تعاون تنظیم کی ایمرجنسی کانفرنس میں سخت اور واضح فیصلہ لیں، یہی کانفرنس واضح کردے گی کہ کون کس قدر سنجیدہ اور رنجور ہے، واقعہ یہی ہے کہ اب یہ سب اقدامات ناکافی ہو چکے، سچ وہی ہے جو فلسطین کی ایک عیسائی مسلم کمیٹی کے ایک پادری کی زبان سے نکلا کہ بیت المقدس کی آزادی کے لئے اب ایک اور صلاح الدین ایوبی کی ضرورت ہے، بیت المقدس کی آزادی کا راستہ غزہ ہوکر جاتا ہے اور اس کی آزادی کے لئے ایک اور صلاح الدین کی ضرورت ہے، مولانا علی میاںؒ نے بہت پہلے رابطہ عالم اسلامی میں یاسر عرفات کو مخاطب کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہہ دیا تھا (اگرچہ مصلحت پسند حضرات حضرت مولانا کے اس پر مغز اور ایمان افروز خطاب کو عارضی اور جذباتی خطاب کہہ کر گزر جاتے ہیں) لیکن درحقیقت مولانا نے سعودیہ کو مرکز اسلام سمجھتے ہوئے وہاں بیٹھ کر پورے عالم اسلام کو پیغام دے دیا تھا، انھوں نے کہا تھا، کہ مسئلہ فلسطین نہ سیاست سے حل ہوگا نہ سیاسی بیان بازی سے، اس کو حل کرنے کے لیے شوق شہادت درکار ہے، اس کو حل کرنے کے لئے صلاح الدین ایوبی کا طریقہ اور پھر سے معرکہ حطین برپا کرنے کی ضرورت ہے، کمزوری کے باوجود مولانا نے پوری ایمانی قوت سے دو مرتبہ خیر الدین زرکلی کا یہ شعر پڑھا تھا۔

هـــات صــلاح الــديــن ثـــانية فيـنـــا
وجــدد حــطيــن أو شبـــه حــطيـنـــا

گاندھی کو مہاتما بنانے والی مسلم یونیورسٹی اور کرناٹک انتخابات

گاندھی کو مہاتما بنانے والی مسلم یونیورسٹی گاندھی کے قاتلوں کی آنکھ میں ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے، وقتاً فوقتاً اس پر الزامات لگائے جاتے ہیں اور اس کی شبیہ کو خراب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جبکہ اس کی حیثیت اور عالمی شہرت کو تسلیم کرنے پر دوست و دشمن سبھی مجبور ہیں، یہ ہندوستان کی اعلیٰ سطحی دانش گاہوں میں سے ایک ہے، یہ حقیقی سیکولرزم کی علامت ہے، ہندو اور مسلم دونوں ہی اس کی آغوش میں اخوت و محبت کا سبق پڑھتے ہیں اور دوسروں کو سکھاتے ہیں کہ مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے حامل لوگوں کو ایک ساتھ کیسے رہنا چاہیے، وہ دنیا بھر میں اپنے کردار و عمل سے یہ پیغام عام کرتے ہیں کہ ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا''۔ لیکن کیا کیجئے اس فرقہ پرستی کا جس کا بھوت ان دنوں پورے ملک میں آتنک پھیلائے ہوئے ہے، موجودہ حکومت کی

بڑی شاطرانہ پالیسی یہ رہی ہے کہ جب اس کے دامن پر کوئی داغ آنے لگتا ہے، میڈیا یا سوشل میڈیا پر اس کی ناکامیوں یا کسی اور ایسے ایشو پر بحث شروع ہوتی ہے جس سے اس کا ناکام کردار اور فسطائی چہرہ سامنے آنے لگتا ہے تو وہ بہت کامیابی کے ساتھ بحث کا رخ موڑ دیتی ہے، اس دور حکومت میں سیکولرزم کی تمام بنیادیں ہل کر رہ گئی ہیں، نہ میڈیا محفوظ ہے نہ عدلیہ اور نہ انتخابات، جب عدلیہ کے متعلق بحث تیز ہوئی تو انتہائی چالاکی سے مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ چھیڑ دیا گیا، جو درحقیقت کوئی مسئلہ ہی نہ تھا، لیکن اس سے ایک طرف تو اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنا مقصود تھا، اٹھنے والے سوالوں کو دبانا تھا اور دوسری طرف کرناٹک میں ہونے والے اسمبلی انتخابات میں نہ صرف اس کا سہارا لینا تھا بلکہ انتخابات سے جڑی بحثوں کو مسلم یونیورسٹی اور جناح کی بحث میں الجھا دینا مقصد تھا، بھاجپا کو کرناٹک کا میدان بہت مشکل نظر آرہا تھا، اپنی پوری طاقت جھونک دینے کے باوجود بھی مشکل ثابت ہوا، مگر جمہوریت کی یہ تعریف ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' ایک بار پھر ثابت ہوتی نظر آرہی ہے، کرناٹک کے گورنر ''وجو بھائی والا'' نے آئین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بلکہ آئین کے ساتھ بھدا اور بھونڈا مذاق کرتے ہوئے بی جے پی کو حکومت تشکیل دینے کی دعوت دے ڈالی ہے، جبکہ ۲۲۲ سیٹوں کی اسمبلی میں بھاجپا کو ۱۰۴ سیٹیں ملی ہیں کانگریس اور جے ڈی ایس نے حکومت بنانے کا دعویٰ پیش کیا اور اصولی طور پر ان کے پاس ۱۱۶ سیٹیں تھیں لیکن ان کے دعوے کو نظر انداز کر دیا گیا، اس سے قبل بھی بھاجپا سینہ زوری کرتے ہوئے چار صوبوں میں حکومت بنا چکی ہے، بہرحال کرناٹک میں خرید وفروخت کا عمل جاری ہے، خدا خیر کرے کہ اب یہ ملک جمہوریت اور آئین کی قتل گاہ بنتا جا رہا ہے، شنید ہے کہ قدیم بھاجپا لیڈر رام جیٹھ ملانی نے گورنر کے خلاف سپریم کورٹ جانے کا اعلان کیا ہے، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ کانگریس عوام کو لے کر میدان میں اترے اور اس غیر آئینی زور آوری کے خلاف عوامی تحریک چلائے، اگرچہ اس سلسلہ میں کانگریس کا دامن صاف نہیں ہے مگر گردش ایام نے اسے قصہ پارینہ بنا دیا ہے، جیسے کل کو بھاجپا کی یہ حرکتیں بھی داستان پارینہ بن جائیں گی، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ملک میں ہر طرح کے فساد کی بنیاد کانگریس کی سربراہی میں رکھی گئی جس کو اب بھاجپا مکمل طور پر نظیر بنا رہی ہے اور اس کا زرخرید میڈیا وہی نظیریں پیش کر رہا ہے، لیکن کانگریس یا سیکولرزم کے دعویداروں اور علمبرداروں کو وقت رہتے ہوش کے ناخن لینے کی ضرورت ہے، اگر بروقت نہ سنبھلے اور پورے ملک میں عوامی تحریک برپا نہ کی تو ۲۰۱۹ء میں ہندوستان کا منظر نامہ ایسے جنگل راج کی مثال ہوگا، جہاں نہ کوئی آئین ہوگا نہ قانون، آج ۱۹ مئی کی خبروں کے مطابق سپریم کورٹ نے گورنر کے فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے صرف آج شام تک کا وقت بھاجپا کو دیا تھا، شام کی خبر کے مطابق وہ اپنی اکثرت ثابت نہ کرسکی، تادم تحریر یہ سوال قائم ہے کہ کیا کانگریس و جے ڈی ایس کا اتحاد حکومت بنا جائے گا اور اگر بنالے تو کتنے دن قائم رہ سکے گی، اس سے قطع نظر اس پر غور کیجئے کہ سپریم کورٹ نے یقیناً مداخلت کی مگر گورنر کے غیر آئینی فیصلہ کو یکسر مسترد نہ کرسکی۔ صرف اس کی مدت کو کم کیا، کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عدلیہ بھی دباؤ میں ہے؟

ملک کے ان سخت ترین حالات میں قابل مبارکباد ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وہ نوجوان طلبہ وطالبات جنہوں نے

بیداری کا ثبوت دیا، فسطائیت کے خلاف طاقت ور آواز اٹھائی اور ملک کو یہ پیغام دیا کہ جب تک گاندھی کو مہاتما کا لقب دینے والوں کی نسلیں زندہ ہیں تب تک گاندھی کو قتل کرنے والے اس ملک میں بے لگام نہیں ہو سکتے، ضرورت تھی کہ ہمارے ملی وسماجی قائدین ان نوجوانوں کی آواز کو تقویت دیتے اور اس طرح ان کا ساتھ دیتے کہ پورے ملک کے سامنے اس سازش کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا مگر افسوس کہ اس مرتبہ بھی حقیقت مسئلہ سے ماوراء بے وقت و بے محل شہنائیاں بجنے لگیں، تصویر کی حلت وحرمت پر بحثیں ہونے لگیں، بے سر پیر کے مشورے اور موقف سامنے آنے لگے۔

حقیقت واقعہ کچھ یوں تھی کہ اس دور حکومت میں حکومت کی شہ پر پورے ملک میں غنڈہ گردی شباب پر ہے، جس کے مختلف رنگ نظر آئے ہیں، لیکن تعلیمی اداروں کو نشانہ بنانا سب سے خطرناک اور بھیانک رنگ ہے، اس سلسلہ میں بھاجپا سے جڑے ہوئے لوگوں نے جے این، یو۔ حیدرآباد یونیورسٹی اور اب علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کو نشانہ بنایا، ۲ مئی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جو واقعہ پیش آیا وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طلبہ یونین کی یہ قدیم روایت رہی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً بلاتفریق مذہب وملت ملک کی اہم شخصیات کو تاحیات رکنیت (لائف ٹائم ممبرشپ) دیتی ہے، 1938 میں یہ رکنیت اس نے مسٹر جناح کو دی تھی، اس مسٹر جناح کا نام ملک کی تحریک آزادی میں شامل افراد میں بہت نمایاں تھا، یہ رکنیت ان کو ان کی خدمات کے اعتراف میں دی گئی تھی، جناح اس ایکٹ کو بنوانے میں بھی شامل تھے جس کے تحت ایم اے او کالج کو مسلم یونیورسٹی کا درجہ ملا تھا، اس لیے جن لوگوں کو اب تک یہ اعزاز دیا گیا ان کے ساتھ جناح کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی، ۲ مئی کو یونین نے سابق نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری صاحب کو بھی یہ اعزاز دینے کے لئے مدعو کیا تھا، مگر یہ تقریب کیا منعقد ہوتی شہ زوری اور غنڈہ گردی نے کچھ اور ہی حالات پیدا کر دیے، جو کچھ ہوا اسے ملک کی تاریخ کا بدترین اور شرمناک واقعہ قرار دیا جائے گا، پولیس کی سرپرستی میں ہندو یواواہنی کے ممبران نے غیر آئینی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو تار تار کرنے والے نعرے لگائے، یونیورسٹی کے سیکورٹی گارڈز سے مار پیٹ کی اور بعض راہ چلتے طلبہ کو بھی زدوکوب کیا، حیرت اس پر تھی، کہ ان افراد کے ہاتھ میں ہتھیار تھے اور پولیس ساتھ میں تھی، ہندوستان کی مؤقر ترین شخصیت یعنی سابق نائب جمہوریہ گیسٹ ہاؤس میں تھے، آخر ان کی سیکورٹی کی ذمہ داری کس کی تھی، جن سے بعد میں ضلع انتظامیہ نے کہا کہ آپ یہاں سے چلے جائیے ہم ان حالات میں آپ کی حفاظت نہ کر سکیں گے۔

طرفہ تماشا یہ کہ جب یونیورسٹی کے طلبہ جمع ہو کر ان غنڈوں کے خلاف رپورٹ درج کرانے کے لئے نکلے تو پولیس نے پوری سفاکی اور بربریت کے ساتھ ان پر لاٹھیاں برسائیں، تقریباً تیس سے زائد طلبہ زخمی ہوئے اور بعض شدید طور سے زخمی ہوئے، لیکن پھر طلبہ کا احتجاج شروع ہوا، جو بعد میں بھوک ہڑتال میں تبدیل ہو گیا اور تادم تحریر جاری ہے، اس مرتبہ یہ بات بھی خوش آئند رہی کہ یونین کے ساتھ فسطائی ذہنیت کے خلاف پوری طلبہ برادری، ٹیچنگ ونان ٹیچنگ اسٹاف سب شامل ہوئے اور شانہ بشانہ نظر آئے۔

یہاں پولیس اور ہندو یواواہنی کے کارکنوں کی طرف سے جو کچھ ہوا اس کا مقصد تاریخی شناخت رکھنے والے اس سیکولر ادارے کے ماتھے کے خوبصورت جھومر کو نوچ کرا سکے کردار پر سوالیہ نشان لگانا تھا، ان ہی لوگوں کے ایک رکن نے ''راشٹر پتا کو قتل کیا تھا'' ان ہی لوگوں نے اب نائب راشٹر پتی کو نشانہ بنا کر مسلمانوں کو یہ پیغام دینا چاہا کہ اب تم لوگ اس ملک میں محفوظ نہیں رہ گئے، لیکن سلام پیش کرنا چاہیے یہاں کے طلبہ کو جنھوں نے ان ظالموں کے عزائم کو ناکام بنایا اور یہ ثابت کیا کہ یہاں ہمیشہ ظالموں کی قبائیں نوچ کر انھیں بے نقاب کیا گیا ہے اور واقعہ ہے کہ یہاں سو بار آکاش کو جھکنے پر مجبور کیا گیا، وہ اور مقامات ہوں گے جہاں سنگھی آتنک خوف و ہراس کا ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، یہاں کی تہذیب میں ہندو مسلمان سب سنگھیوں کے خلاف صف آرا نظر آئے، یہ حقیقت ہے کہ دو تین طلبہ حملہ آوروں کے ساتھ دیکھے گئے، مگر اس سے بڑا سچ ہے کہ ہندو طلبہ کی ایک بڑی تعداد یونین کے ساتھ دیکھی گئی، جب دھرنا دینے والے طلبہ نے باب سید پر نماز پڑھی تو متعدد ہندو طلبہ ان کی نگرانی کے لیے ارد گرد کھڑے رہے، متعدد ہندو طلبہ برادران کی سوشل میڈیا پوسٹ اور ٹوئیٹ نے یہاں کی تہذیب کو آشکارا کیا اور سنگھی ذہنیت کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔

اس پوری کارروائی کے لیے یونین ہال میں لگی جناح کی تصویر کا سہارا لے کر ماحول خراب کرنے کی سازش کی گئی، سوال یہ ہے جس کو پوری شدت سے اٹھانا چاہیے کہ جب بھاجپا کے لوگ جناح کے مزار پر چادر چڑھا سکتے ہیں، کتاب لکھ کر جناح کو سیکولر ثابت کر سکتے ہیں، جناح کو ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار کہہ سکتے ہیں، بغیر کسی سرکاری شیڈول کے جناح کے ملک میں کباب کھائے جا سکتے ہیں، محض خیر سگالی کے لئے جناح کے ملک کے وزیر اعظم کو اپنی تقریب حلف برداری میں خاص مہمان کی حیثیت دے سکتے ہیں تو پھر صرف مسلم یونیورسٹی میں لگی اس تصویر پر ہنگامہ کیوں؟ ہم تو آر ایس ایس اور ہندو یواواہنی سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس تصویر سے پہلے اس سر کی فکر کرے جو جناح کی قبر پر جھکا، جناح کے اس بنگلے کو ڈھائے جس کی حفاظت خود حکومت کرتی ہے، اس جناح ٹاور کو زمین بوس کرے جو وطن کی سرزمین پر موجود ہے، اور جناح ہی کیوں انگریز آقاؤں کی تمام مورتیوں اور تصویروں کو نیست و نابود کرنے کی مہم چلائے، ملک کی تقسیم کرنے والے سے اس قدر نفرت مگر ملک کو غلام رکھ کر ملک کے باشندوں پر مظالم کے پہاڑ توڑنے والوں کی اتنی عزت افزائی بجائے خود دیش بھکتی یعنی نیشنلزم پر سوالیہ نشان لگاتی ہے، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ملک کی تقسیم میں جتنا جناح کا کردار ہے اس سے زیادہ دوسروں کا ہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو مولانا آزاد نے بہت واضح انداز میں بیان کیا ہے اور دور آخر میں اس حقیقت کو مشہور بھاجپا لیڈر جسونت سنگھ نے تسلیم کیا ہے، تقسیم کے دستاویز پر جناح کے دستخط بھی بعد میں ہیں اور نیچے ہیں تو پھر نفرت صرف ایک جناح سے کیوں؟ اور اگر نفرت ہے تو پھر ہندوستان کی ہر کتاب سے اس کی تصویر ختم کی جائے، پارلیمنٹ میں لگی اس کی تصویر کو آگ لگائی جائے، سپریم کورٹ میں موجود تصویر کو اتار کر پھینکا جائے، نیشنل آرکائیو اور نیشنل لائبریری سے اس کی تصویریں ہٹائی جائیں، صرف مسلم یونیورسٹی کے یونین ہال کو لے کر یہ ہنگامہ آرائی کیوں؟ آخر مودی جی سے بھی معلوم کیا جائے ممبئی ہائی کورٹ کی افتتاحی تقریب میں آپ کیسے شامل ہوئے جہاں جناح کی پورٹریٹ موجود تھی؟

اس پورے واقعہ میں پولیس اور گودی میڈیا کا وہی کردار پھر سامنے آیا ہے جس سے ملک کی سالمیت کو خطرہ ہے اور جس کا کھیل گزشتہ چار سال سے جاری ہے، لیکن افسوس اس پر ہے کہ اب تک ہماری ملی تنظیمیں اور قیادتیں منصوبہ سازی اور صحیح حکمت عملی اختیار کرنے میں ناکام رہی ہیں، اب اس وقت ضرورت تھی کہ وہ آگے بڑھ کر سوال کرتیں، طلبہ پر ہوئے ظلم کے خلاف تحریک چلاتیں، ان کے مطالبات کو ملی سطح پر اٹھاتیں، مگر نہیں! جہاں ضرورت ہو وہاں خاموشی، اور جہاں نقصان ہو وہاں مظاہرے، جلسے اور کانفرنسیں۔

اب کرناٹک الیکشن بھی ہو گیا، وہاں جمہوریت کے قتل ناحق کی تیاری بھی چل رہی ہے، جناح کا جن بھی بوتل میں جا چکا ہے، ہمارا ملی تنظیموں سے اس موقع پر مطالبہ ہے کہ خدارا 2019 سے پہلے ایک میز پر بیٹھ جائیں اور کوئی مشترکہ منصوبہ بنالیں، کرناٹک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کو سنجیدگی سے لیں اور اس سلسلہ میں حکمت عملی تیار کریں، دیش بچانے اور جمہوریت کا تحفظ کرنے والی کانفرنسوں کے بجائے ٹھوس اور متحدہ منصوبہ بندی کی راہ اپنائیں، اب تک طلبہ کے کسی ایک بھی جائز مطالبہ کو نہیں تسلیم کیا گیا، اس کے لیے آگے آئیں، مسلم یونیورسٹی کے وقار و تحفظ کا مسئلہ ہے، اپنے دامن میں تیس مساجد رکھنے والی یہ یونیورسٹی بہر حال اسلامی اور اقلیتی شناخت رکھتی ہے، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کے دستور میں مرکزی اور بنیادی حیثیت یونیورسٹی کی جامع مسجد کو دی گئی ہے، اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی اسلامی اور اقلیتی شناخت کے ساتھ خود کو ہمیشہ سیکولر رکھا ہے اور اس ملک میں سیکولرزم کو پروان چڑھایا ہے، اسی لیے وہ ہمیشہ فسطائیت کے نشانے پر رہی ہے، ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں ٹھوس اقدامات کیے جائیں، اگر میڈیا، پولیس، عدلیہ، گورنر اور آئین سب کو یوں ہی حکومت وقت کی چاکری کے لئے چھوڑ دیا گیا اور وقت رہتے ٹھوس اور سخت فیصلے نہ لیے گئے تو پھر وہ دن دور نہیں جب ہمارا وجود بھی ہمیں بوجھ محسوس ہوگا۔

☆☆☆

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

نوٹ

محترم قارئین! رمضان وعید الفطر کی تعطیلات کے پیش نظر ندائے اعتدال کا اگلا شمارہ جولائی واگست کا مشترک ہوگا۔ امید کہ معذرت قبول فرمائیں گے۔ ادارہ

❑ خاص تحریر

سعودی عرب- یوسفی گر نہیں ممکن تو زلیخائی کر

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ملک عبدالعزیز سعودی عرب کے ایک دیندار حکمراں تھے، شاہ فیصل اسی سعودی خاندان کے بیدار مغز اسلامی حمیت سے لبریز اور مسلمانوں کے خیرخواہ تھے ،عالم عرب کی دینی تحریک اخوان المسلمون کے ہمدرد تھے ،اورانہوں نے مغربی طاقتوں کو تیل کی سپلائی بند کرنے کا تاریخی قدم اٹھایا تھا۔اسی خاندان کا اب ایک ولی عہد اسلام کو رسوا کرنے والا اور مغربی طاقتوں اور امریکہ کے چشم وابرو کو دیکھ کر چلنے والا اور اخوان کو دہشت گرد قرار دینے والا بداطوار شہزادہ ہے جو حرمین شریفین کی سرزمین میں رسوا کن تبدیلیوں کا اور مغربی ثقافت کا اور فسق وفجور کا علم بردار ہے۔ایک فارسی شاعر ,,غنی'' نے کہا تھا پیر کنعان (حضرت یعقوب) کی سیہ بختی کا اور غم کا کیا حال بیان کیا جائے کہ جس کے صاحب زادہ نے یوسفی کا نام روشن کرنے کے بجائے زلیخائے وقت کی دلی آرزو اور گناہ کی تمنا پوری کردی اور اس کے دام ہوس کا شکار ہوگیا۔اور اس نے خاندان کی عزت کو داغدار کردیا۔

غنی روز سیاہِ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

سعودی عرب میں اس وقت جو تبدیلیاں آرہی ہیں اس کا آغاز ۶۰۔۷۰ سال پہلے شروع ہوگیا تھا، شروع میں زیادہ تر لوگوں کو اس کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔۱۹۵۰ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مکہ مکرمہ سے اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کو خط لکھا تھا اس میں اپنے شدید رنج وتاثر کا اظہار کیا تھا، اس میں یہ جملہ موجود ہے کہ ,,عالم اسلام کا قبلہ بیشک مکہ مکرمہ ہے لیکن مکہ مکرمہ (سعودی عرب) کا قبلہ امریکہ بن گیا ہے۔'' انہوں نے حقیقت حال کی ایسی سچی تصویر اپنے موئے قلم سے کھینچی تھی جس سے بہتر تصویر ممکن نہیں تھی ۔انہوں نے خط میں لکھا تھا کہ ,,خالص عربی لباس میں کتنے دل ودماغ خالص مغربی بن چکے ہیں'' اب پچھلے چند برسوں سے یہ تبدلیاں اور برائیاں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ سعودی عرب میں داخل ہونے لگی ہیں اور ملک کی تہذیب ومعاشرت کو چشم زدن میں بدل دینے اور امریکی ثقافت کے ہم دوش بنادینے کی کوشش ہورہی ہے۔سینما ہال اور تھیٹر وبائے عام کی طرح پھیلتے جارہے ہیں۔شاید وہ دن بھی آنے والے ہیں کہ ,,بنے گا سارا جہاں میخوانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا''۔سعودی عرب کے حکمراں جنہیں اپنے ملک کو امریکہ اور مغرب کی عسکری طاقت اور صنعتی طاقت کا ہمسر بنانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی اور اسلامی تہذیب وتمدن کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرنی چاہئے تھی جنہیں مسجد اقصی کا غم ایسا ہونا چاہیے تھا جیسا کسی ماں کا غم ہوتا ہے جس کا بچہ موت کی آغوش میں چلا جائے اور

اس کے اندر ایسی حمیت ہونی چاہئے تھی کہ فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل کا وجود برداشت نہ کر سکے جو اسلام کے پیغام کو پوری دنیا میں پھیلانے کا عزم کرے۔لیکن اب یہ حکمراں قصدا اور عمدا تعیش اور تفریح کا ذوق عوام وخواص سب پر مسلط کر رہے ہیں۔عریاں رقص اور بے حیائی کے مناظر کو فروغ دیا جارہا ہے۔اب یہ حال ہوگیا ہے کہ دنیا کے ہر مسلمان کی زبان پر یہ مصرعہ ہے ,,چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی'' سعودی عرب دینی اخلاقی خودکشی کی طرف جارہا ہے۔اخلاق قدریں پامال اور بداخلاقی کے پودے نہال ہیں، ہر مسلمان کو درد وغم ہے کہ سعودی حکمراں اب مغربی تہذیب اور اباحیت اور اخلاقی پستی کے مخالف ہونے کے بجائے اس کے پرچم بردار بن چکے ہیں۔اس مغرب زدگی کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے، بقول کلیم عاجز

جناب شیخ پر افسوس ہے، ہم نے تو سمجھا تھا
حرم کے رہنے والے ایسے نامحرم نہیں ہوں گے

موجودہ سعودی عرب کا موجودہ منظر نامہ اختصار کے ساتھ یہ ہے:

ا۔سعودی عرب اپنا تشخص کھوتا جارہا ہے۔حرم اور مسجد نبوی کے کسٹوڈین اور خادم الحرمین ہونے کی وجہ سے اس کی جو مثالی شخصیت اور قائدانہ حیثیت تھی ختم ہوتی جارہی ہے۔امر بالمعروف کے بجائے امر بالمنکرات پر زور صرف ہورہا ہے مغربی تمدن اور اقدار کو بے چوں چرا قبول کیا جارہا ہے بلکہ ان کو رواج دیا جارہا ہے ۔بڑے شہر میں سینما ہال اور کاسینو کھولے جارہے ہیں۔ساحل سمندر پر ایسی تفریح گاہیں بنائی جارہی ہیں جہاں خواتین صرف بکنی پہن کر لباس برہنگی میں جاسکیں گی اور ,, جہاں عام دیدار یار ہوگا ''۔پردہ جو ایک اسلامی شعار تھا وہ عقل پر سعودی حکمرانوں کے پڑ گیا ہے۔پوری قوم نغمہ وساز اور عود وبخور میں غرق ہوگئی ہے ,,حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے'' اب جزیرۃ العرب اسلام کی پناہ گاہ نہیں چراہ گاہ بن گیا ہے پتھر تو ہیرا بنتا ہے لیکن یہاں ہیرا پتھر بن رہا ہے۔اس جرم کے خلاف آواز بلند کرنا ضروری ہے۔برائیوں کو اور گناہوں کو برداشت کر لینا بھی گناہ کر لینے کی طرح کا جرم ہے اور اس کی سزا بھی بہت سخت ہے، جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اجتناب کرتے ہیں وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہوجاتے ہیں۔

۲۔جن تنظیموں نے ملک کے اندر اور بیرون ملک نوجوانوں کی تربیت کے لئے عربی زبان میں بہترین اسلامی لٹریچر تیار کیا ان تنظیموں کو اور ان کتابوں کے مصنفین کو دہشت گرد قرار دیا گیا ہے۔یوسف القرضاوی جیسی شخصیت جو عالم اسلام کے بڑے عالم دین ہیں اور جن کی خدمات کے اعتراف میں پہلے خود سعودی حکومت فیصل ایوارڈ دے چکی ہے وہ اب معتوب ومغضوب ہیں اور ان کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے۔اخوان المسلمون کی اسلامی حکومت مصر میں محمد مرسی کی صدارت میں قائم ہوئی لیکن اس صالح حافظ قرآن اور متقی انسان کی حکومت اسے گوارا نہ ہوسکی۔مصر کی اخوانی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے سعودی عرب نے پانچ ہزار ملین ڈالر کی مدد دی۔مرسی کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں پورے طور پر ملوث سعودی حکمراں تھے تاکہ مصر پھر سے بدکاری کا اڈہ بن جائے اور وہاں شراب وکباب کی ساری سرمستیاں شروع ہوجائیں،سعودی عرب کی مالی سرپرستی میں ہزاروں اخوانیوں کو مسجد رابعہ میں اور مسجد الفتح میں اور رابعہ عدویہ کے میدان میں شہید کیا گیا ۔اسلامی حکومت سعوی عرب کے لئے ایک ڈراونا خواب ہے خود سعودی عرب میں اسلامی حکومت نہیں ہے وہاں کا سیاسی نظام معاشی اور مالیاتی نظام سب غیر اسلامی ہے۔اسلامی نظام عدل کا مطالبہ

کرنے والے جیلوں میں بند ہیں۔

۳۔سعودی عرب کے عالم وداعی شیخ محسن العواجی کو جیل میں بند کیا گیا۔شیخ محمد عریفی کو گرفتار کیا گیا،مشہور زمانہ کتاب ''لاتحزن'' کے مصنف شیخ عائض القرنی، شیخ سلمان بن عودہ، شیخ سفر الحوالی، شیخ سعد الفقیہ اور شیخ محمد المسعری اور شیخ العواجی کو حق اور ضمیر کی آواز بلند کرنے پر پابندیوں کا اور نظر بندی کا سامنا کرنا پڑا۔انہوں نے بولنا چاہا تو ان کی زبان بند کردی گئی اب ملت کے باضمیر علماء ہر حلقہ زنجیر میں اپنی زبان رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی آواز کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور دھمکیاں دی جاتی ہیں۔پچاسوں علماء ہیں جو خوف سے بہ آواز بلند کچھ کہنے کی ہمت نہیں کرتے ہیں۔اور گھٹن محسوس کرتے ہیں۔انہیں بولنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔

۴۔سعودی عرب کے جرائم کا رکارڈ بہت طویل ہے اس نے دنیائے اسلام کے تمام بدکردار حکمرانوں کی سرپرستی کی۔تیونس کے بدکردار حاکم زین الدین بن علی کو پناہ دی۔سعودی عرب نے حسنی مبارک کی حمایت میں بھی فتوے جاری کئے تھے لیکن یہ تیر نشانہ پر نہیں لگ سکا اور آخر کار مصر کے اسلام پسند عوام نے حسنی مبارک کا تختہ الٹ ڈیا۔

۵۔حرمین شریفین خطرہ میں ہے۔ملک کے اندر اور باہر امریکی فوجیں موجود ہیں۔امریکہ کے لئے سب سے بڑی لالچ سعودی عرب کا پٹرول ہے۔اس وقت آئینہ امروز کے ساتھ اندیشہ فردا رکھنے کی سخت ضرورت ہے۔اپنے ملک کو اس حالت میں رکھنا کہ کوئی غیر ملکی طاقت اس پر آسانی سے قبضہ کرلے جیسے کوئی گدھ گوشت کا ٹکڑا اچک لے جائے یہ جہالت بھی ہے اور نادانی بھی ہے۔ٹھیک ہے بظاہر فورا اس کے ابھی آثار نہیں ہیں لیکن مستقبل کو کون جانتا ہے کیا ماضی میں ایسا نہیں ہوا تھا کہ فرانسیسی استعمار نے مصر پر الجزائر اور مراکش اور شام پر قبضہ کیا تھا۔کیا برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ نہیں کیا تھا اور اس کے بعد وہاں اسرائیل کا قیام عمل میں آیا سعودی عرب نے تاریخ سے سبق کیوں نہیں سیکھا ہے حرمین شریفین کی حفاظت کا طریقہ یہ تھا کہ سعودی عرب کو امریکہ اور مغربی طاقتوں کے ہم پلہ طاقتور ملک بنایا جاتا۔اس کے لئے ضرورت تھی کہ ملک کو سائنسی اور صنعتی اعتبار سے ترقی دی جاتی،اسلحہ سازی کی جاتی، وہاں ہر طرح کے صنعتی کارخانے قائم کئے جاتے۔صنعتی انقلاب کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک سرمایہ اور دوسرے علمی اور سائنسی قابلیت۔جہاں تک سرمایہ کا تعلق ہے تو پٹرول کے ملکوں کے پاس جو دولت اور ثروت ہے اس سے بہت کم سرمایہ سے انگلینڈ میں صنعتی انقلاب آیا تھا اور جہاں تک تجربہ اور علمی قابلیت کی ضرورت ہے تو سعودی عرب اور خلیجی ملک پورے عالم اسلام سے جوہر قابل کو اکٹھا کرسکتے تھے۔کم نظری اور بے بصری ہے کہ یہ سب بالکل نہیں کیا گیا اور پوری قوم کو صارفین کی کنزیومرس کی قوم بنا کر رکھ دیا گیا ہے اور اقبال کا مصرعہ ان خلیجی ملکوں پر صادق آتا ہے ,,جس کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو'' وحی الٰہی کے حکم کی صاف طور پر خلاف ورزی کی گئی جس میں اسلحہ سازی کا حکم دیا گیا ہے اور معیار یہ بنایا گیا ہے کہ تمہارے دشمن اور خدا اور رسول کے دشمن تم سے خوف زدہ ہوجائیں۔اگر کہا جائے کہ سعودی عرب اور خلیج کے حکمرانوں نے آخر درجہ کی نا اہلیت کا ثبوت دیا ہے تو یہ بات ہرگز غلط نہیں ہوگی۔ساری دولت خرچ کرکے وہ اسلحے باہر سے منگائے جاتے ہیں جن کا استعمال بھی سعودی فوج نہیں جانتی، کیا اسی طرز حکمرانی سے اسرائیل کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور اسلام کی سربلندی کے کام کئے جاسکتے ہیں؟

۶۔۔ملک میں سعودایزیشن شروع ہوچکا ہے یعنی صرف سعودی

شہریت رکھنے والوں کو ملازمت دینے کا حکم جاری ہو چکا ہے۔ غیر سعودیوں کے لئے ملازمت کے دروازے بہت محدود کر دئے گئے ہیں اور غیر سعودی خاندان کے ہر فرد پر بچے اور بوڑھے مرد اور عورت سب کو تین سو ریال ماہانہ ٹیکس ادا کرنے کا فرمان جاری ہو گیا ہے۔ آئندہ اس میں سال بسال اضافہ ہوتا رہے گا۔ یعنی دوسرے ملکوں کے ملازمین اپنے گھروں کو بھیجنے کے لئے جو بچت کرتے تھے اس بچت کو ان سے چھین لیا گیا ہے پہلے زمانہ میں اسلامی ملکوں میں غیر مسلموں سے جو جزیہ لیا جاتا تھا وہ بھی اس سے بہت کم ہوا کرتا تھا۔ غیر ملکیوں پر اس نئے قسم کے ,,جزیہ'' کے قوانین کی وجہ سے سعودی عرب میں کام کرنے والے ہزاروں ہزار غیر سعودی ملازمین اپنے اپنے ملکوں کو افتاں وخیزاں بادیدہ گریاں واپس جا رہے ہیں اس شاہی حکم نامہ کی وجہ سے دکانیں بند ہو رہی ہیں اور بازار بے رونق ہو رہے ہیں کیونکہ ان دکانوں پر غیر سعودی ملازمین ہی بیٹھا کرتے تھے۔ ایک صاحب گھر سے دوائیں خریدنے کے لئے مارکٹ پہونچے تو انہوں نے دیکھا کہ بازار میں میڈیسن کی دونوں دکانیں (صیدلیۃ) بند ہیں انہوں نے ایک پاکستانی سے وجہ پوچھی تو اس نے شاعرانہ انداز میں جواب میں کہا,,وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے'' سعودی باشندوں کو اس نئی غیر منصفانہ پالیسی کا نقصان یہ اٹھانا پڑا ہے کہ ان کی دکانیں بازار اور مال اور ہوٹل تو بند ہوتے ہی جا رہے ہیں ان کے گھر بھی جو غیر سعودی باشندے کرایہ پر لیتے تھے ویران ہو گئے ہیں اور ہزاروں گھروں پر تالے لٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سعودی عرب کے ایک شہر دمام کے ایک بہت بڑے اسکول میں ۳۶ ہزار غیر ملکی طلبہ پڑھتے تھے ان کی تعداد اب ۱۶ ہزار رہ گئی ہے یہی حال جدہ کے اسکولوں کا بھی ہے۔ ایک ویرانی سی ویرانی ہے۔ گلشن مملکت سعودی عرب میں خزاں چھا گئی ہے۔

خزاں کے ہاتھوں گلوں پر نہ جانے کیا گذری
چمن سے آج صبا بے قرار گذری ہے

۷۔ سعودی عرب امریکہ اور مغربی ملکوں کے جال میں پوری طرح سے پھنس چکا ہے۔ سعودی عرب پہلے ایک بہت خوش حال ملک تھا اب وہ خستہ حال ملک ہو چکا ہے اور پہلے انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ (آئی ام اف) اور ورلڈ بنک کا وہ مقروض نہیں تھا اب وہ ان اداروں سے قرض لینے پر مجبور ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود اربوں اور کھربوں ڈالر کے مالیاتی معاہدے وہ دلداری اور دل بدست آوری کے لئے امریکہ اور مغربی ملکوں سے کر رہا ہے اور ایسے ہتھیار خرید رہا ہے جن کا استعمال سعودی فوج کے بڑے سے بڑے جنرل بھی نہیں جانتے ہیں، نہ ان کو اس کی ٹریننگ ملی ہے یہ سارے ہتھیار برائے زینت وآرائش اور برائے نمائش ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ترکی ہے جو آئی ام اف اور ورلڈ بینگ کو قرض دینے کی پوزیشن میں آ گیا ہے اور جس نے اپنے ہاں تنخواہوں میں تین سو فی صد کا اضافہ کر دیا ہے۔ سعودی عرب بجائے اس کے کہ ترکی سے سبق حاصل کرتا اور اس کو دوست بناتا اس نے بغض وحسد کی وجہ سے ترکی کو شیطان اور بدی کا محور قرار دے دیا ہے۔ ایسی ناشائستہ زبان ترکی نے کبھی استعمال نہیں کی۔ اسی سے ترکی اور سعودی تہذیب کا فرق معلوم ہو سکتا ہے۔

آخری بات

اب آخری بات، مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات۔ آج کچھ دردمرے دل میں سوا ہوتا ہے، دل میں طوفان اٹھ رہا ہو اور غیرت اور حمیت کی وجہ سے خون کھول رہا ہو تو خود بخود جوش وجوانی، شعلہ بیانی اور تحریر میں جولانی اور قلم میں روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہنر زخم نمائی ہے نہ کہ بے مقصد مضمون نگاری، یہ زخم کی نمائش نہ کہ

الفاظ کی نمائش۔اگر ہم حرم کی سرزمین میں چراغ نہیں جلا سکتے تو اپنا دل تو جلا سکتے ہیں۔غم اور غصہ کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی عزت وناموس خطرہ میں ہے اور اس وقت سعودی عرب میں اسلام کی عزت داغ دار ہورہی ہے۔سعودی عرب کی، اپنے مقدس مقامات کی وجہ سے، تمام مسلمانوں کے دلوں میں خاص منزلت ہے، جب سعودی عرب اپنا قبلہ امریکہ کو بنالے گا اور اس کا تابع فرمان ہوگا تو اس کی تکلیف ہر مسلمان اپنے دل میں محسوس کرے گا۔اس کا خون کھولے گا۔چنانچہ آج دنیا کے تمام مسلمان سعودی عرب کے نئے حالات کی وجہ سے بے چین اور مضطرب ہیں۔یہ اضطراب خود سعودی عرب میں عوام اور خواص میں موجود ہے۔خود سعودی خاندان غیر مطمئن ہے۔علماء مجبور ہیں کہ ,,بات پرواں زبان کٹتی ہے'' اور ,,چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے'' وہاں کے علماء خوف تعزیر سے چپ رہتے ہیں خود سعودی عرب میں حمیت اور غیرت والوں نے زبان کھولنے کی کوشش کی تو ان کو خاموش کردیا گیا۔سعودی عرب میں حالات کو صحیح رخ پر ڈالنے کے لئے قیادت کی تبدیلی یا اصلاح از بس ضروری ہے۔آج مشرق ومغرب کے مسلمان بے چینی سے اس ملک کے افق پر ایک نئے ستارہ کے طلوع ہونے کا انتظار کررہے ہیں: اس ملک میں فوجی بغاوت اس لئے ممکن نہیں ہے کہ امریکی فوج جو ملک کے اندر اور باہر قریب کے ملکوں میں موجود ہے وہ اپنی لاڈلی حکومت اور لاڈلے شہزادے اور تخت سلیمانی کی حفاظت کے لئے عفریت من الجن والی طاقت سے پلک جھپکتے پہونچ جائے گی اور ہم خود بھی فوجی بغاوت اور خون ریزی نہیں چاہتے ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی اطمنان نہیں ہے کہ جو لوگ انقلاب بردوش بن کر آئیں گے وہ کتنے اسلام کے وفادار ہوں گے لیکن اصلاح بہر حال ضروری ہے اور اس اصلاح کی ذمہ داری دنیا کے علماء کرام کے دوش ناتواں پر ہے۔اب علماء بھی اگر خاموش ہوجائیں اور خوف سے یا ویزے کی لالچ میں لب سی لیں تو حق کی بات کون کہے گا۔اور ''کلمۃ حق عند سلطان جائر'' کا فریضہ کون ادا کرے گا۔ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ سعودی عرب اور علماء کے درمیان کوئی ناجنگ معاہدہ ہوگیا ہے اور کوئی خفیہ سمجھوتہ ہوگیا ہے۔ سعودی عرب میں کچھ بھی ہو علماء خاموش رہتے ہیں۔اس وقت ہر مفکر ہر صاحب قلم اور صاحب زبان اور ہر صاحب ایمان پر اگر اس کا ضمیر زندہ ہے اصلاح کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔یہ برائیاں کہیں بھی ہوں وہ برائیاں کہلائیں گی لیکن ان برائیوں کا جزیرۃ العرب میں پایا جانا ناقابل برداشت ہے۔اس وقت ہر مسلمان سربزانو ہے، سر بگریباں ہے انگشت بدنداں ہے کہ یہ کیا ہورہا ہے حرم کی سرزمین پر اسلام کی بے حرمتی ہورہی ہے۔اس لئے اب عالمی پیمانہ پر رائے عامہ کی تشکیل کی ضرورت ہے عالم اسلام کے ملکوں میں اردو عربی اور انگریزی میں اور دوسری زبانوں میں بیانات دینے اور سعودی عرب کی قیادت کو اصلاح کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ,, الدین نصیحۃ'' یعنی دین خیرخواہی کا نام ہے تمام مسلمان علماء اور قائدین سلفی اور حنفی، اہل حدیث اور اہل سنت والجماعت، دیوبندی اور بریلوی سب برسرعام اور برسرمنبر اس بات کا اظہار کریں کہ سعودی عرب میں جو تبدیلیاں لائی جارہی ہیں وہ ناقابل قبول ہیں اور وہ صاف کہیں کہ حرمین شریفین کی سرزمین پر کسی کی اجارہ داری نہیں وہ کسی کی ذاتی ملکیت اور جائداد نہیں اور قائدین اور علماء اپنے بیانات کی کاپی سعودی سفارت خانہ کو بھی بھیج دیں اور یہ سعودی سفارت خانہ کی ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ اور اضطراب کی خبر اپنے یہاں وزارت خارجہ تک پہونچائے۔لیکن سفارت خانہ اپنی کارگذاری دکھانے کے لئے صرف وہ چیزیں بھیجتا ہے جس میں سعودی عرب کی تعریف اور ستائش ہوتی ہے۔ایک عالم

دین نے فرمایا کہ ,,ہم اگر تنقید کریں گے تو پھر ہمارے عمرہ کا کیا ہوگا اور ہمیں ویزا کیسے ملے گا'' ایسے کج اندیش اور کج فکر عالم کو کیسے سمجھایا جائے کہ اگر حق گوئی کی یہ قیمت ادا کرنی پڑے کہ آدمی عمرہ سے محروم ہوجائے تو اس حالت میں عمرہ نہ کرنے کا ثواب عمرہ کرنے سے بڑھ جاتا ہے۔ زادالمعاد میں اور سیرت کی کتابوں میں ایک اہم واقعہ مذکور ہے جس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لئے اور حق کا ساتھ دینے کے لئے عمرہ اور طواف کعبہ جیسی عبادت کو بھی چھوڑا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ کہ جب حضورﷺ عمرہ کے ارادہ سے حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تو قریش غصہ میں بے قرار اور خفا تھے آپ ﷺ نے حضرت عثمان کو قاصد بنا کر قریش کے پاس بھیجا تا کہ وہ اطمنان دلا دیں کہ ہم جنگ کے لئے نہیں آئے ہیں بلکہ عمرہ کے ارادہ سے آئے ہیں۔ حضرت عثمان گئے اور ابو سفیان اور قریش کے دوسرے سربرآوردہ حضرات سے گفتگو کی اور رسول اللہﷺ کا پیغام پہونچایا۔ اس موقعہ سے قریش کے سرداروں نے کہا کہ آپ اگر عمرہ اور طواف کرنا چاہیں تو کرلیں۔ حضرت عثمان نے اس موقعہ اور اجازت سے بالکل فائدہ نہیں اٹھایا اور صاف کہ دیا کہ جب تک حضورﷺ طواف اور عمرہ نہیں کریں گے ہم بھی نہیں کریں گے۔ جب حضرت عثمان حدیبیہ واپس پہونچے تو مسلمانوں نے کہا کہ تم تو بہت فائدہ میں رہے عمرہ اور طواف کرلیا اور اپنے دل کا ارمان نکال لیا۔ حضرت عثمان نے جواب دیا ,,تم لوگون نے بدگمانی سے کام لیا ہے قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مجھے ایک سال بھی وہاں ٹھہرنا پڑتا اور رسول اللہﷺ مدینہ میں تشریف فرما ہوتے تب بھی میں اس وقت تک طواف نہ کرتا جب تک حضور طواف نہ فرما لیتے، مجھے تو قریش نے طواف کی دعوت بھی دی تھی مگر میں نے صاف انکار کردیا'' اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمین شریفین کی بے حرمتی اس طرح ہورہی ہو کہ وہاں حاکم وقت کی ایما پر فسق وفجور کو فروغ دیا جارہا ہو تو محض عمرہ کی خواہش پوری کرنے کے لئے حق گوئی سے اعراض کرنا درست نہیں اور وہ اصحاب قلم اور وہ تمام سالک وصوفی اور تمام شیوخ وامام مجرم ہیں جو امید کرم پر ایسے حاکموں کے لئے شعری اور نثری قصیدے لکھتے ہیں اور اس کے سفارت خانہ میں اپنا دست طلب دراز کرتے ہیں۔ وہ عمرہ بہت مہنگا بھی ہے اور بے ثواب بھی ہے جو ضمیر کو موت کی نیند سلا کر کے کیا جائے۔

کیا برصغیر کے علماء واقعی بے ضمیر ہوچکے ہیں کہ صرف حج وعمرہ کے لئے اور ایک کف جو کے عوض حق گوئی سے گریز کریں گے۔

سرزمین حجاز کا معاملہ جان ودل سے عزیز تر شئی کا معاملہ ہے۔ ہم تمام قائدین، تمام علماء کرام اور تمام اہل قلم سے اپیل کرتے ہیں کہ اس موضوع پر خاموشی اختیار نہ کریں۔ اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کھل کر کریں اور سفارت خانہ کو وزارت خارجہ کو اور خادم الحرمین کو اپنے احتجاج کی کاپی بھیجیں اور اسے ایک ضروری دینی کام سمجھ کر انجام دیں۔ ہم یہاں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی ایک تحریر کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

''آج ملت کی قد آور شخصیتیں، مذہبی تنظیمیں، اور نمائندہ ادارے مصلحت کی دبیز چادر میں اپنا منہ چھپائے ہوئے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں اللہ کے دربار میں اس طرح حاضر ہونا پڑے کہ ہماری پیشانی پر رحمت خداوندی کی امید کا نور نہ ہو، بلکہ اپنی بے ضمیری کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے ناامیدی کا داغ ہو''۔

☆☆☆

□ گوشۂ رمضان

ماہ رمضان کا قرآن کریم سے تعلق

ڈاکٹر محمد نجیب قاسمی سنبھلی
ریاض

قرآن کریم کو رمضان المبارک سے خاص تعلق اور گہری خصوصیت حاصل ہے۔ چنانچہ رمضان المبارک میں اس کا نازل ہونا، حضور اکرم ﷺ کا رمضان المبارک میں تلاوتِ قرآن کا شغل نسبتاً زیادہ رکھنا، حضرت جبرئیل علیہ السلام کا رمضان المبارک میں نبی اکرم ﷺ کو قرآن کریم کا دور کرانا، تراویح میں ختم قرآن کا اہتمام کرنا، صحابۂ کرام اور بزرگان دین کا رمضان میں تلاوت کا خاص اہتمام کرنا، یہ سب امور اس خصوصیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ لہذا اس ماہ میں کثرت سے تلاوتِ قرآن میں مشغول رہنا چاہئے۔

ماہ رمضان کا قرآن کریم سے خاص تعلق ہونے کی سب سے بڑی دلیل قرآن کریم کا ماہ رمضان میں نازل ہونا ہے۔ اس مبارک ماہ کی ایک بابرکت رات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوح محفوظ سے سماء دنیا پر قرآن کریم نازل فرمایا اور اس کے بعد حسب ضرورت تھوڑا تھوڑا حضور اکرم ﷺ پر نازل ہوتا رہا اور تقریباً ۲۳ سال کے عرصہ میں قرآن مکمل نازل ہوا۔ قرآن کریم کے علاوہ تمام صحیفے بھی رمضان میں نازل ہوئے جیسا کہ مسند احمد میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مصحف ابراہیمی اور تورات وانجیل سب کا نزول رمضان میں ہی ہوا ہے۔ نزول قرآن اور دیگر مقدس کتب وصحائف کے نزول میں فرق یہ ہے کہ دیگر کتابیں جس رسول و نبی پر نازل ہوئیں ایک ساتھ ایک ہی مرتبہ میں، جبکہ قرآن کریم لوح محفوظ سے پہلے آسمان پر رمضان کی مبارک رات یعنی لیلۃ القدر میں ایک بار نازل ہوا اور پھر تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّـآ اَنزَلنٰهُ فِی لَیلَةِ القَدرِ۔ وَمَآ اَدرٰئكَ مَا لَیلَةُ القَدرِ۔ لَیلَةُ القَدرِ، خَیرٌ مِّن اَل?فِ شَهرٍ۔ تَنَزَّلُ المَلآءِكَةُ وَالرُّوحُ فِیهَا بِاِذنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ اَمرٍ۔ سَلٰم، هِیَ حَتّٰی مَطلَعِ الفَجرِ۔ بے شک ہم نے قرآن کریم کو شب قدر میں اتارا ہے، یعنی قرآن شریف کو لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اِس رات میں اتارا ہے۔ آپ کو کچھ معلوم بھی ہے کہ شب قدر کیسی بڑی چیز ہے، یعنی اس رات کی بڑائی اور فضیلت کا آپ کو علم بھی ہے، کتنی خوبیاں اور کس قدر فضائل اس میں ہیں۔ اس کے بعد چند فضائل کا ذکر فرماتے ہیں، شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے، یعنی ہزار مہینوں تک عبادت کرنے کا جتنا ثواب ہے اس سے زیادہ شب قدر کی عبادت کا ہے، اور کتنا زیادہ ہے؟ یہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس رات میں فرشتے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر کو لے کر زمین کی طرف اترتے ہیں۔ اور یہ خیر وبرکت فجر کے طلوع ہونے تک رہتی ہے۔

سورۃ العلق کی ابتدائی چند آیات سے قرآن کریم کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد آنے والی سورۃ القدر میں بیان کیا کہ قرآن کریم رمضان کی بابرکت رات میں اترا ہے، جیسا کہ سورۃ الدخان کی آیت ۳ (اِنَّا اَنزَلنَاہ فِی لَیلَةٍ مُّبَارَكَةٍ) ہم نے اس کتاب کو ایک مبارک رات میں اتارا ہے) اور سورۃ البقرہ کی آیت ۱۸۵

(شَهرُ رَمَضَانَ الَّذِی اُنزِلَ فیه القرآن) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا) میں یہ مضمون صراحت کے ساتھ موجود ہے۔غرض قرآن وحدیث میں واضح دلائل ہونے کی وجہ سے امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ قرآن کریم لوح محفوظ سے سماء دنیا پر رمضان کی مبارک رات میں ہی نازل ہوا، اس طرح رمضان اور قرآن کریم کا خاص تعلق روز روشن کی طرح واضح ہوجاتا ہے۔

رمضان المبارک کے قرآن کریم کے ساتھ خاص تعلق کا مظہر نماز تراویح بھی ہے۔احادیث میں وارد ہے کہ ہر سال ماہ رمضان میں آپ ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کے نازل شدہ حصوں کا دور کرتے تھے۔جس سال آپ ﷺ کا انتقال ہوا اس سال آپ ﷺ نے دوبار قرآن کریم کا دور فرمایا۔(بخاری ومسلم) نماز تراویح آپ ﷺ نے شروع فرمائی اور مسجد میں باجماعت اس کو ادا بھی فرمایا لیکن اس خیال سے اس کو ترک کردیا کہ کہیں امت پر واجب نہ ہوجائے اور پھر امت کے لئے اس کو ادا کرنے میں مشقت ہو۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ نے (رمضان کی) ایک رات مسجد میں نماز تراویح پڑھی۔لوگوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ پھر دوسری رات کی نماز میں شرکاء زیادہ ہوگئے، تیسری یا چوتھی رات آپ نماز تراویح کے لئے مسجد میں تشریف نہ لائے اور صبح کو فرمایا کہ میں نے تمہارا شوق دیکھ لیا اور میں اس ڈر سے نہیں آیا کہ کہیں یہ نماز تم پر رمضان میں فرض نہ کردی جائے۔(مسلم۔الترغیب فی صلاۃ التراویح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قیام رمضان کی ترغیب تو دیتے تھے لیکن وجوب کا حکم نہیں دیتے تھے۔آپ فرماتے کہ جو شخص رمضان کی راتوں میں نماز (تراویح) پڑھے اور وہ ایمان کے دوسرے تقاضوں کو بھی پورا کرے اور ثواب کی نیت سے یہ عمل کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے سابقہ گناہ معاف فرمادیں گے۔رسول اللہ ﷺ کی وفات تک یہی عمل رہا، دورِ صدیقی اور ابتداء عہد فاروقی میں بھی یہی عمل رہا۔(مسلم۔الترغیب فی صلاۃ التراویح) صحیح مسلم کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم کی حیات میں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور خلافت میں نماز تراویح جماعت سے پڑھنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، صرف ترغیب دی جاتی تھی اور انفرادی طور پر نماز تراویح پڑھی جاتی تھی۔البتہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یقیناً تبدیلی ہوئی، اس تبدیلی کی وضاحت محدثین، فقہاء اور علماء کرام نے فرمائی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عشاء کے فرائض کے بعد وتروں سے پہلے پورے رمضان باجماعت نماز تراویح شروع ہوئی، نیز قرآن کریم ختم کرنے اور رمضان میں وتر باجماعت پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔سعودی عرب کے نامور عالم، مسجد نبوی کے مشہور مدرس اور مدینہ منورہ کے (سابق) قاضی الشیخ عطیہ محمد سالم (متوفی ۱۹۹۹ء) نے نماز تراویح کی چودہ سو سالہ تاریخ پر عربی زبان میں ایک کتاب (التراویح اکثر من الف عام فی المسجد النبوی) تحریر کی ہے جو اس موضوع کے لئے بے حد مفید ہے۔

قرآن اور رمضان کے درمیان چند مشترک خصوصیات: قرآن اور رمضان کی پہلی اہم مشترک خصوصیت تقویٰ ہے، جیسا کہ قرآن کریم کی آیات میں ذکر ہے۔دوسری مشترک خصوصیت شفاعت ہے۔حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ روزہ اور قرآن کریم دونوں بندے کے لئے شفاعت کرتے ہیں۔روزہ عرض کرتا ہے کہ یا اللہ میں نے اس کو دن میں کھانے پینے سے روکے رکھا، میری شفاعت قبول کرلیجئے، اور قرآن کہتا ہے کہ یا اللہ میں نے رات کو اس کو سونے سے روکا، میری شفاعت قبول کرلیجئے، پس دونوں کی شفاعت قبول کرلی جائے گی۔ (رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر والحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم)۔

تیسری خصوصیت جو رمضان اور قرآن دونوں میں مشترک طور

پر پائی جاتی ہے وہ قرب الٰہی ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت کے وقت اللہ تعالیٰ سے خاص قرب حاصل ہوتا ہے، ایسے ہی روزہ دار کو بھی اللہ تعالیٰ کا خاص قرب حاصل ہوتا ہے کہ روزہ کے متعلق حدیث قدسی میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں خود ہی روزہ کا بدلہ ہوں۔مضمون کی طوالت سے بچنے کیلئے قرآن ورمضان کی صرف تین مشترک خصوصیات کے ذکر پر اکتفاء کرتا ہوں۔

اسلاف کا ماہ رمضان میں تلاوت قرآن کا خاص اہتمام : روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ وتابعین وتبع تابعین رمضان المبارک میں قرآن کریم کے ساتھ خصوصی شغف رکھتے تھے۔بعض اسلاف واکابرین کے متعلق کتابوں میں تحریر ہے کہ وہ رمضان المبارک میں دیگر مصروفیات چھوڑ کر صرف اور صرف تلاوت قرآن میں دن ورات کا وافر حصہ صرف کرتے تھے۔امام مالک، جنہوں نے حدیث کی مشہور کتاب موطا تحریر فرمائی ہے، جو مشہور فقیہ ہونے کے ساتھ ایک بڑے محدث بھی ہیں لیکن رمضان شروع ہونے پر حدیث پڑھنے پڑھانے کے سلسلہ کو بند کرکے دن ورات کا اکثر حصہ تلاوتِ قرآن میں لگاتے تھے۔ اسلاف سے منقول ہے کہ وہ ماہ رمضان اور خاص کر آخری عشرہ میں تین دن یا ایک دن میں قرآن کریم مکمل فرماتے تھے۔صحیح مسلم کی سب سے زیادہ مشہور شرح لکھنے والے اور ریاض الصالحین کے مؤلف نے اپنی کتاب "الاذکار" ص ۲۰۱ میں ایسے شیوخ کا ذکر فرمایا ہے جو ایک رکعت میں قرآن کریم ختم فرماتے تھے۔رمضان کے مبارک مہینہ میں ختم قرآن کریم کے اتنے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔لہذا اس مبارک مہینہ میں زیادہ سے زیادہ اپنا وقت قرآن کریم کی تلاوت میں لگائیں۔ نماز تراویح کے پڑھنے کا اہتمام کریں اور اگر تراویح میں ختم قرآن کا اہتمام کیا جائے تو بہت بہتر وافضل ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ ہر سال ماہ رمضان میں آپ ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کے نازل شدہ حصوں کا دور کرتے تھے۔جس سال آپ کا انتقال ہوا اس سال آپ نے دو بار قرآن کریم کا دور فرمایا۔ ماہِ رمضان کے بعد بھی تلاوتِ قرآن کا روزانہ اہتمام کریں خواہ مقدار میں کم ہی کیوں نہ ہو، نیز علماء کرام کی سرپرستی میں قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں۔قرآن کریم میں وارد احکام ومسائل کو سمجھ کر اُن پر عمل کریں اور دوسروں تک پہنچائیں۔اگر ہم قرآن کریم کے معنی ومفہوم نہیں سمجھ پا رہے ہیں تب بھی ہمیں تلاوت کرنا چاہئے کیونکہ قرآن کی تلاوت بھی مطلوب ہے۔حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ایک حرف قرآن کریم کا پڑھے اس کے لئے اس حرف کے عوض ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے۔میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔(ترمذی)

تلاوت قرآن کے کچھ آداب ہیں جن کا تلاوت کے وقت خاص خیال رکھا جائے تاکہ ہم عند اللہ اجر عظیم کے مستحق بنیں۔ تلاوت چونکہ ایک عبادت ہے لہذا ریا وشہرت کے بجائے اس سے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ومقصود ہو، نیز وضو وطہارت کی حالت میں ادب واحترام کے ساتھ اللہ کے کلام کی تلاوت کریں۔تیسرا اہم ادب یہ ہے کہ اطمینان کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اور اچھی آواز میں تجوید کے قواعد کے مطابق تلاوت کریں۔تلاوت قرآن کے وقت اگر آیتوں کے معانی پر غور وفکر کرکے پڑھیں تو بہت ہی بہتر ہے۔قرآن کریم کے احکام ومسائل پر خود بھی عمل کریں اور اس کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔

☆☆☆

❑ پیام عید

عیدالفطر- انعام واکرام کا دن

انیس الرحمٰن قاسمی
امارت شرعیہ، بہار

عید خوشی کا دن ہے؛ تاکہ اس میں اللہ کے احسان واکرام کو یاد کرکے اس کا شکریہ ادا کیا جاسکے، اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ''اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جارہا ہے؛ تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار واعتراف کرو اور شکر کرو''۔ (سورۃ البقرہ: ۸۵)

عید کا دن اجتماعی عبادت وشادمانی اور خدا کی رضاء وخوشنودی کا دن ہے، انسانی فطرت ہے کہ قوم کے سارے افراد بڑے اور چھوٹے جب کسی خاص مقصد کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر بڑی جگہ جمع ہوتے ہیں تو فطری طور پر ان کے اندر مسرت وشادمانی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ دن ان کے لیے زندگی سے بھرپور دن بن جاتا ہے۔ اس دن ان کی افرادی شان وشوکت کا اظہار ہوتا ہے، عید کا دن بھی امت محمدیہ کے لیے ایسا ہی دن ہے جس میں ان کی خوشی وشادمانی کا ظہور ہوتا ہے اور ایک خاص مقصد سے جمع ہونے پر ان کی روح میں بالیدگی اور عظمت وجلالت میں اضافہ ہوتا ہے؛ مگر افسوس ہے کہ عہد رسالت سے جیسے جیسے زمانہ طویل گذرتا گیا اور نور نبوت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہونے لگا عید کا مقصد اور خطبۂ عید کا حقیقی پیغام بھی فوت ہوتا گیا اور عید کی روح وحقیقت پر توجہ کے بجائے رسوم وعادات اور ظاہری صورت وشکل کی نگہداشت پر قوت صرف ہونے لگی۔ اس لیے آج اس بات کی ضرورت ہے کہ عید کی اصل حقیقت وروح کو عام کیا جائے اور بتایا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی عید کیسی ہوا کرتی تھی۔

جو چیز انسان کی روحانی زندگی کے لیے سمِ قاتل اور روح کو اس کے اصل منبع وسرچشمہ (ذات الٰہی) سے پھیرنے والی ہے وہ ہے خواہشات نفس کی پیروی، جس کے تحت انسان اندھا ہوکر معدہ کی پرستش شروع کردیتا ہے، اور ہر جائز وناجائز حلال وحرام سے اس جہنم کو بھرنے میں لگ جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر انسان کی ساری زندگی معدہ کے نظام کے گرد گردش کرنے لگتی ہے۔ روزہ اسی لذت پسندی وخواہشات نفس کی پیروی پر روک لگاتا ہے اور رمضان کے پورے مہینہ میں جب کوئی شخص صبح صادق سے غروب آفتاب تک معدہ کے نظام پر بھوکا پیاسا رہ کر قابو پالیتا ہے اور حقیقی روزہ اسے نصیب ہوتا ہے تو اس کو تقویٰ کا منصب عطا ہوتا ہے اور وہ اللہ کے نزدیک متقین میں شمار ہوتا ہے اور مہینہ ختم ہونے پر جس شام چاند نظر آتا ہے تو اس کی بلند روحانی زندگی کی تکمیل ہوجاتی ہے اور اس رات اللہ کی طرف سے انعام واکرام کی بارش ہوتی ہے۔ اسی لیے ایمان والوں کو ہلال عید کا انتظار ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار (عید

الفطر) کرو اور اگر چاند نظر نہ آئے تو پھر تیس دن کی گنتی پوری کرو''۔(صحیح البخاری باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا رأیتم الہلال فصوموا)

رمضان کے آخری دنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں اعتکاف کرتے تھے۔اور آخری دن صحابہ کرام چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے تھے اور چاند نظر آجاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتادیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے تھے اور جب چاند نظر آجاتا تو اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے:''**اللّٰھم اھلہ علینا بالامن و الإیمان والسلامۃ والإسلام، ربی وربک اللّٰہ**''. (سنن الترمذی باب مایقول عندرویۃ الہلال، ابواب الدعوات)(اے اللہ! اس چاند کو ہمارے لیے امن وایمان اور سلامتی واسلام کا چاند بنا کر نکال۔اے چاند میرا اور تمہارا رب اللہ ہی ہے۔)

ایمان سے بھرپور وذکر الٰہی سے تر زبان کے اوپر جاری یہ دعائیہ الفاظ اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ مؤمن کی توجہ ہر لمحہ اللہ کی طرف ہونی چاہئے۔عید گرچہ چاند کی رونمائی پر معلق ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ چاند بے تاثیر ہے وہ تو علامت ہے حکم رب کی اور رب ایک ہی ہے جو ہماری اور ساری کائنات اور نظام شمسی کی پرورش کرتا ہے اور وہ اللہ ہے۔

ہلال عید کے طلوع کے ساتھ اعتکاف ختم ہوجاتا ہے اور شب عید شروع ہوجاتی ہے، یہ شب ایسی ہے جو انعام واکرام کے لیے خاص ہے۔اس لیے ایمان والے بندے اس شب کو گپ شپ کی محفلوں یا بازاروں ودکانوں میں نہیں گزارتے بلکہ اللہ جل شانہ کے اکرام وانعام کے انتظار میں اس کی عبادت میں مشغول ہوجاتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ اس رات میں خاص عبادت کی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شب کے بارے میں فرمایا ہے:''پھر جب عید الفطر کی رات ہوتی ہے تو اس کا نام (آسمانوں پر) لیلۃ الجائزہ یعنی انعام کی رات سے لیا جاتا ہے''۔(المعجم الکبیر للطبرانی باب فیما اعداللہ عزوجل للمؤمنین:۱/۲۲۶)''جو شخص پانچوں راتوں میں (عبادت کے لیے) جاگے اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔لیلۃ الترویہ (آٹھ ذی الحجہ کی رات) ،لیلۃ العرفہ نوی ذی الحجہ کی رات،لیلۃ النحر دسویں ذی الحجہ کی رات اور عید الفطر کی رات اور شب برأت یعنی پندرہ شعبان کی رات''۔(مصنف عبدالرزاق الصنعانی باب النصف من شعبان)۔

اسی لیے فقہاء نے بھی عیدین کی رات میں جاگنا اور عبادت کرنا مستحب لکھا ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ پانچ راتیں دعا کی قبولیت کی ہیں:''جمعہ کی رات، عیدین کی راتیں، رجب کے مہینہ کی پہلی رات اور نصف شعبان کی رات''۔(السنن الکبریٰ للبیہقی باب عبادۃ لیلۃ العیدین) آپ غور کیجیے کہ شب عید ختم ہوتے ہی جب مشرق سے سورج کی پہلی شعاع فضاء بسیط پر پڑنے لگتی ہے اور صبح صادق طلوع ہوتی ہے تو فرشتے زمین پر قطار لگا کر کھڑے ہوجاتے ہیں؛ تاکہ ایمان والوں کا عیدگاہ کے راستہ میں استقبال کریں،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ہیں اور عید کی شروعات بھی مدینہ کی آمد سے فرضیت صیام رمضان کے بعد ہوئی ہے، یہ ۲ھ کا سال ہے،گرمی کا موسم ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز ادا کرتے ہیں اس کے بعد صلوٰۃ العید کی تیاری فرماتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کو خاص طور پر غسل فرمایا،غسل کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ اپنے بالوں میں کنگھا کرتے،آنکھوں میں سرمہ لگاتے،خوشبو لگاتے،اگر ناخن بڑھے ہوئے ہوتے تو ان کو تراشتے اور بدن کے زائد بالوں کو اتارتے۔

غسل کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے روز اپنے موجود کپڑوں میں جو عمدہ کپڑا ہوتا، اسے زیب تن فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یمنی حلہ تھا، جس کی دھاریاں سرخ تھیں، عام طور پر اس حلہ کو پہنتے اور لوگوں کو آپ جمعہ اور عیدین کے لیے عمدہ کپڑا پہننے کے لیے فرماتے؛ کیونکہ اس جیسے اجتماع کے موقع پر عمدہ کپڑا حسب استطاعت پہننا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، یہ قطعاً مناسب نہیں کہ عید کے لیے لازمی طور پر غیر ضروری اخراجات کرکے نئے اور بیش قیمت کپڑے بنائے جائیں۔ اس زمانہ میں نئے کپڑوں کی خریداری اور عید کے لیے اس کو جزو لازم کے طور پر اختیار کرنے کا مزاج پیدا ہوگیا ہے اس میں اسراف وفضول خرچی عام ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ جانے سے پہلے صدقۃ الفطر کی ادائیگی کا حکم فرماتے تھے تاکہ مسرت کے اس دن میں صدقۂ فطر کے ذریعہ محتاجوں ومسکینوں کی بھی شکم سیری وآسودگی کا انتظام ہوجائے اور اللہ کے حضور عیدگاہ اس حال میں جائیں کہ اگر ان کی زبان کی بے احتیاطوں و بے باکیوں سے روزے پر جو برے اثرات پڑے ہوں یہ صدقۂ فطر ان کا کفارہ بھی ہوجائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل فرماتے ہیں: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزوں کو فضول ولایعنی اور فحش باتوں کے اثرات سے پاک وصاف کرنے کے لیے اور مسکینوں محتاجوں کے کھانے کے بندوبست کے لیے صدقہ فطر کو واجب قرار دیا''۔ (سنن ابی داؤد باب زکوۃ الفطر)

صدقۂ فطر کی مزید تفصیل، اس کی ادائیگی کے وقت اور مقدار کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں سے ہر غلام وآزاد پر اور ہر مرد وعورت پر اور ہر بڑے اور چھوٹے پر صدقۂ فطر لازم کیا ہے اور یہ صدقہ فطر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ صدقہ فطر نماز عید کے لیے جانے سے پہلے ادا کردیا جائے''۔ (صحیح البخاری باب فرض صدقۃ الفطر)

یہ صدقہ غریبوں ومسکینوں پر واجب نہیں ہے بلکہ ایسے مالدار وغنی شخص پر واجب ہے جو عید کے دن ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا یا اس کے بقدر روپیہ کا مالک ہو۔ ایسا شخص خود اپنی طرف سے اور اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے بھی ادا کرے گا۔ یہ تو واجب ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ جو شخص اتنی مالیت نہ رکھتا ہو وہ بھی صدقہ فطر نکالے تاکہ فقراء ومساکین کے لیے اس دن تنگی نہ ہو اور خود اس کے روزہ کے برے اثرات زائل ہوجائیں، اگر صدقۂ فطر رمضان میں ادا کیا جائے تو بھی صحیح ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ جانے سے پہلے چند کھجوریں کھاتے تھے تاکہ یہ دن جو اللہ کی طرف سے ''فطر'' یعنی روزہ نہ رکھنے اور کھانے کا دن ہے، اس کا اظہار ہوسکے۔ رمضان کے مہینہ میں نہ کھانا اور نہ پینا ہی عبادت تھا اور آج اللہ کی رضا وخوشنودی اس میں ہے کہ صبح صبح کچھ کھائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر کے دن نماز کو تشریف لے جانے سے پہلے چند کھجوریں کھاتے تھے جو طاق عدد میں ہوتے تھے (تین، پانچ یا سات)''۔ (صحیح البخاری باب الأکل یوم الفطر قبل الخروج)

جب روشنی پھیل جاتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ کے لیے روانہ ہوتے، عام طور پر آپ کا معمول ہوتا کہ ایک راستہ سے گزرتے ہوئے عیدگاہ جاتے اور دوسرے راستہ سے نماز کے بعد واپس آتے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن (عیدگاہ جانے اور آنے میں) راستہ بدل دیتے تھے''۔ (صحیح البخاری باب من خالف الطریق اذا رجع یوم العید)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مدینہ طیبہ کی آبادی سے باہر وہ صحرائی میدان عیدگاہ کے لیے مخصوص تھا جہاں حجاج آ کر ٹھہرتے اور سامان اتارتے تھے۔ یہ مسجد نبوی سے تقریباً ایک ہزار قدم کی دوری پر مشرقی جانب میں تھا۔ اسکے اردگرد کوئی چہار دیواری نہ تھی بلکہ ایک چٹیل صحرائی میدان تھا جس میں آپ نماز عید ادا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام بالغ مردوں کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتیں اور بچے بھی عیدگاہ پہنچتے تھے اور مردوں سے الگ ایک جگہ عورتیں جمع ہوتی تھیں اور نماز پڑھتی تھیں۔ گرچہ ان پر یہ نماز واجب نہ تھی۔ لیکن زمانۂ مابعد میں جب مسلم معاشرہ میں فساد آ گیا اور ان کے نکلنے اور عیدگاہ جانے میں فتنہ و شر کا اندیشہ پیدا ہوگیا تو جس طرح فقہاء امت نے جمعہ اور نماز پنجگانہ کے لیے خواتین کا مسجدوں میں آنا مناسب نہیں سمجھا اسی طرح نماز عید کے لیے ان کا عیدگاہ جانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عیدگاہ پہنچتے تو آفتاب افق سے تقریباً دو نیزہ اوپر بلندی پر جا کر چمک رہا ہوتا۔ آپ کے پہنچنے کے بعد صفیں درست ہوجاتیں اور آپ نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ جاتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے نیزہ گاڑ دیا جاتا تھا، آپ نماز دو رکعت پڑھاتے تھے اور اس میں قرآن مجید کی تلاوت قیام کی حالت میں بلند آواز سے کرتے تھے۔ کبھی سورۂ ق اور سورۂ قمر اور کبھی سورہ اعلیٰ اور سورۂ غاشیہ پڑھا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کر فارغ ہوتے تو لوگوں کی طرف رخ کر کے خطبہ کے لیے کھڑے ہوتے اور لوگ بدستور صفوں میں بیٹھے رہتے۔ پھر آپ ان کو وعظ و نصیحت فرماتے اور احکام دیتے۔ اگر آپ کا ارادہ کوئی لشکر یا دستہ تیار کر کے کسی طرف روانہ کرنے کا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے بعد اس کو بھی روانہ کرتے۔ اسی طرح کسی دیگر اجتماعی و انفرادی امور سے متعلق آپ کو کوئی حکم دینا ہوتا تو اسی موقع پر وہ بھی دیتے تھے۔ کبھی ضرورت ہوتی تو جہاں عورتیں جمع ہوتیں وہاں جا کر ان کو وعظ و نصیحت کرتے بالخصوص صدقہ و خیرات ادا کرنے کی ترغیب دیتے۔ (بخاری کتاب العیدین)

عیدین کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عیدگاہ میں ہوا کرتی تھی، البتہ ایک بار عید کے دن بارش ہوئی تھی اس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''مسجد'' میں عید کی نماز پڑھی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ایک دفعہ عید کے دن بارش ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو عید کی نماز مسجد نبوی میں پڑھائی''۔ (سنن ابن ماجہ باب ما جاء فی صلاۃ العید فی المسجد إذا کان مطر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صحابہ کرام عید کی خوشیاں مناتے تھے اور ایک دوسرے کو ملاقات کے وقت عید کی مبارکباد دیتے تھے اور اس کے لیے دعائیہ کلمات کہتے تھے جیسے ''تقبل اللہ منا و منک''. (الدعاء للطبرانی باب الدعاء فی العیدین) یعنی اللہ ہمارے اور تمہارے اعمال کو قبول کرے۔ بعض روایتوں میں عید کے دن فنون سپہ گری و نیزہ بازی وغیرہ کا مظاہرہ کرنے اور گھروں میں عید کی خوشی میں نظم و اشعار گانے اور پڑھنے کا واقعہ بھی منقول ہوا ہے۔ اللہ ہمیں عید کی اصل حقیقت و روح کو عام کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

☆☆☆

❑ تذکرۂ فاتحین

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ

تحریر: عبدالمنعم الہاشمی

ترجمہ: محمد عالم ندوی
استاد: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

سعد بن ابی وقاص بن مالک بن اہیب بن عبد مناف ان دس خوش نصیبوں میں سے ہیں جن کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت سنائی گئی، اور لمبی عمر پائی۔

سلسلہ نسب میں سے اہیب بن عبد مناف سیدۃ آمنہ رسول اللہ کی والدہ ماجدہ کے چچا ہوا کرتے تھے، اس طرح پانچویں پشت میں جا کر آپ کا اور رسول اللہ ﷺ کا سلسلہ نسب ایک ہو جاتا ہے، اور آپ رشتہ میں رسول اللہؐ کے ماموں ہوئے، ایک موقع سے حضرت عمرؓ نے حضرت سعد سے فرمایا سعد اس دھوکہ میں مت رہنا کہ تم رسول اللہ کے ماموں ہو۔

حضرت سعد کی والدہ حمنہ بنت سفیان بن امیۃ ہیں۔ اسی ہاشمی اور قریشی خاندان میں حضرت سعد کی ولادت ہوئی، عالی نسبی اور شرافت وراثت میں ملی، جزیرۃ العرب میں کسی بچہ کا اس قریشی خاندان میں پیدا ہو جانا بڑی اعزاز کی بات تھی کیوں کہ یہ ایسا خاندان تھا جس میں بیت اللہ کے متولی اور حجاج کے خادم موجود تھے، اور یہ اعزاز بھی اسی قریشی خاندان کے ایک فرد کو ملا تھا، جس نے بیت اللہ کے کونوں سے ان بتوں کو باہر نکال پھینکا تھا جو برسوں سے اپنی چوکھڑیاں جمائے بیٹھے تھے۔

قبول اسلام:

حضرت سعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دعوت پر اسلام لائے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت سعد اسلام قبول کرنے والوں میں سے ساتویں نمبر پر ہیں، ابوبکر، علی، زید بن حارثہ، بلال بن رباح، رسول اللہ کے زمانۂ جاہلیت کے دوست عبسہ سلمٰی، خالد بن سعد بن العاص اور سعد بن وقاص۔ اگر اس میں حضرت خدیجہ کو بھی شامل کر دیا جائے تو ان کا نمبر آٹھواں ہو جائے گا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت سعد کو ایک بڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، وہ خود بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں اپنی والدہ کا بڑا فرمانبردار تھا، جب میری والدہ کو میرے قبول اسلام کی خبر ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئیں، یہاں تک کہ کھانا پینا چھوڑ دیا، اور مجھ سے کہا، یا تو اس دین کو چھوڑ دے ورنہ میں بھوکے پیاسے جان دے دوں گی۔ حضرت سعد کہتے ہیں میں نے والدہ کی بہت منت سماجت کی کہ وہ کھانا پینا شروع کر دیں لیکن انھوں نے میری ایک نہ سنی میں نے عرض کیا اگر آپ کی ایک ہزار جانیں بھی ہوں، اور وہ ایک ایک کر کے نکلیں، تب بھی میں اس دین کو نہیں چھوڑ سکتا، بالآخر میری ثابت قدمی رنگ لائی، والدہ نے کھانا شروع کر دیا، اور اللہ رب العزت کی جانب سے سورہ لقمان کی آیت: ۱۵ نازل ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ آپ سابقین الاولین میں سے ہیں، مہاجر مدینہ ہیں، سعد بن عبادہ کے مواخاتی بھائی ہیں، اپنی پوری زندگی اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے۔

حضرت سعد اور سر زمین عراق:

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ تک یہ خبر پہنچی کہ امین الامۃ حضرت ابوعبیدہؓ شہید کر دیئے گئے اور عراق کی جنگ میں آتش پرست ایرانیوں کا پلہ بھاری ہے، کسریٰ کی تمام فوجیں ایک جنرل کی قیادت میں مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں۔

۱۴ھ کو حضرت عمرؓ نے یہ ارادہ کیا کہ وہ بذات خود کسری کے مقابلہ کے لئے جائیں گے اور مسلم فوج کی قیادت کریں گے، یہ خبر آگ کی طرح مدینہ میں پھیل گئی نوجوانان اسلام فوج میں شامل ہونے لگے، خود خلیفۃ المسلمین عمرؓ مدینہ کے قریب مقامِ طورتک فوج لے کر نکل آئے۔

طلحہ بن عبید اللہ مقدمۃ الجیش پر اور عبدالرحمٰن بن عوف میمنہ پر تعینات تھے اور زبیر بن العوام امیرِ لشکر تھے، جبکہ حضرت عمر کی نیابت مدینہ میں حضرت علیؓ کر رہے تھے، تقریبا عوام کی اکثریت حضرت عمرؓ کے نکلنے کی تائید میں تھی، جبکہ عبدالرحمٰن ابن عوف کی رائے اس کے خلاف تھی، انھوں نے حضرت عمر سے عرض کیا، امیر المومنین آپ پر ہمارے ماں باپ قربان آپ کا مدینہ میں رہنا زیادہ مفید ہے آپ کسی کو قائد بنا کر بھیج دیں، کیوں کہ خوانخواستہ اگر ہمارے لشکر کو شکست ہوئی، اور آپ شہید کر دئے گئے یا شکست کھا گئے، تو پھر آپ کی بھرپائی بڑی مشکل ہے، اور ارتداد کا اندیشہ ہے، عمرؓ کو یہ رائے پسند آئی، اور فرمایا عبدالرحمٰن تمہی بتاؤ کس کو امیر بنا کر بھیجا جائے۔ عبدالرحمٰن ابن عوف نے کہا کہ سعد بن ابی وقاص اس معرکہ کے لئے زیادہ مناسب ہیں۔

عمرؓ: میں مانتا ہوں کہ سعد ایک بہادر آدمی ہیں، لیکن تدبیر جنگ اور سپہ سالار کی قابلیتوں کی طرف سے اطمینان نہیں کرتا۔

عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا، یقیناً بہادری میں ان کا کوئی جواب نہیں، اللہ کے رسول کی صحبت سے بھی فیض یاب رہے ہیں، جنگ بدر میں بھی شریک تھے، حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ سعد بن وقاص کو اس معرکہ کی قیادت کے لئے تیار کریں، حضرت سعد کا ذکر خیر چل ہی رہا تھا کہ ان کی جانب سے ایک پیغام موصول ہوا، کیوں کہ سعد اس وقت حضرت عمر کے حکم سے قبیلہ ہوازن میں صدقات کی وصولی کے لئے گئے ہوئے تھے، پیغام میں لکھا تھا، امیر المومنین میں نے ایک ہزار بہادر سپاہی جمع کر لئے ہیں جو تجربہ کار ہیں صاحب تدبیر ہیں، حضرت عمر نے ان کو ایک وصیت نامہ لکھا اور فرمایا۔

سعد یہ مت سمجھنا کہ تم رسول اللہ کے ننہالی رشتہ داروں میں سے ہو، یہ یاد رہے کہ خدا کا ایک قانون ہے وہ یہ کہ وہ برائی کو برائی سے ختم نہیں کرتا ہے، بلکہ برائیوں کا خاتمہ اچھائیوں اور نیکیوں سے فرماتا ہے، خدا کے یہاں حسب ونسب کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ وہاں تو صرف طاعت کا سکہ چلتا ہے، سب خدا کے بندے ہیں، اور اس کو اپنے بندوں سے اطاعت وفرمانبرداری مطلوب ہے لہذا ہر معاملہ میں رسول اللہ کے طریقہ کو دیکھو اور پھر اسی طرح اپنے معاملات کو انجام دو۔

حضرت عمر کے خط پہنچنے کے بعد حضرت سعد مسلمان مجاہدین کی ایک جماعت لے کر عراق کی جانب نکل گئے، اس وقت لشکر کی تعداد چودہ ہزار تھی، حضرت عمر ہر شخص کو حضرت سعد کے پیچھے بھیج دیتے تھے جو اطراف مدینہ سے جہاد میں شرکت کے لئے آتا تھا، لہذا دھیرے دھیرے یہ تعداد ۲۰ ہزار تک پہنچ گئی، اور دس ہزار مجاہدین شام سے آکر اسی لشکر میں شامل ہوگئے، اس لشکر کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں ۹۹ حضرات بدری صحابہ تھے، ان مجاہدین کا عراق میں حضرت مثنی ابن حارثہ کے لشکر سے ملنے طے تھا، لیکن ان میں سے ابھی صرف آٹھ ہزار مجاہدین عراق سے تیس میل کی دوری پر تھے کہ حضرت مثنی ابن حارثہ کا انتقال ہوگیا، اور حضرت سعد اور مثنی کی ملاقات بھی نہیں ہو پائی، لیکن مثنیؓ حضرت سعد کی خبر لشکر کو سنا چکے تھے، حضرت سعد نے مثنی کی فوج میں ان کے جانشین کو یہ حکم بھیجا کہ ایرانیوں سے اپنی زمین پر رہ کر جنگ کریں، ان کی سرحد میں نہ گھسیں تا آنکہ پیچھے سے ہم لوگ پہنچ جائیں، ہمارے پہنچنے کے بعد ایرانیوں پر ایک زبردست حملہ کرنا ہے۔

حضرت سعد ابھی مقام شراف میں تھے کہ ان کو عراق کی جانب بڑھنے کا حکم ملتا ہے، حضرت سعد نے عراق پہنچ کر پورے حالات حضرت عمر کو لکھے، حضرت عمر نے جواب میں لکھا۔

میرا یہ خط جب تمہارے پاس پہنچے تو لوگوں کی دس دس ٹکڑی بنا دینا ان کا امیر اور عریف بھی مقرر کر دینا، لشکر کی صف بندی کرنا، تمام مسلمان امراء کو جمع کرنا، ان کی تعداد کا اندازہ لگانا، اور پھر ان کو مورچوں پر تعینات کر دینا، پوری فوج کو ایک ساتھ قادسیہ کے مقام

پر بھیجنا، مغیرۃ بن شعبہ کو مع ان کے سواروں کے اپنے ساتھ ملا لینا، ان تمام انتظامات کی تکمیل کے بعد مجھے خبر کرنا۔

حضرت عمر کے اس پیغام سے قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ نہایت ہی متفکر تھے، اسی وجہ سے حضرت سعد کی خود رہبر و رہنمائی فر رہے تھے، چونکہ مدینہ میں آپ یہ سن رہے تھے کہ سعد کو جنگی تجربہ زیادہ نہیں ہے، قادسیہ کی جنگ میں مسلمانوں کی فتح نے حضرت سعد کے قائدانہ رول کو ماننے پر مجبور کر دیا۔

حضرت سعد نے حضرت عمرؓ کے ہدایات کے مطابق حضرت مغیرۃ کو بلایا، قبائل کے سرداروں کو جمع کر کے ان کو مورچہ بندی کا حکم دیا، دس دس فوجیوں کی ٹکڑی بنائی، ان کا ایک ایک سردار بنایا، سابقین الاولین میں سے مقام ریت پر چند لوگوں کو متعین کیا، آپ کی عمر کے فرمان کی اطاعت کا یہ عالم تھا کہ اس وقت تک اپنے قدم نہیں ہٹائے جب تک کہ ہو بہو اس حکم نامہ کو نافذ نہیں کر دیا، اور پھر پوری کارگزاری حضرت عمر کو لکھ بھیجی وہاں سے فوراً دوسرا ہدایت نامہ آتا ہے۔

اب خدا کا نام لے کر اپنے لشکر کے ساتھ ایران کا رخ کرو، خدا پر بھروسہ رکھو، اپنے معاملات میں اللہ سے مدد مانگو، اور یاد رکھو تمہارا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے، جس کی تعداد بہت زیادہ ہے، تیاری مکمل ہے، سخت جنگجو ہے، مضبوط قلعوں والی ہے، یہ ملک اپنے تالابوں، نہروں، اور قلعوں کی وجہ سے بظاہر خوبصورت ہے لیکن اس کو پار کرنا، اور شہر میں داخل ہونا بڑا دشوار ہے۔

حضرت عمر نے اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے چاہا کہ وہ سب چیزیں لکھ دوں جن سے ایک جرنل کو جنگ میں واسطہ پڑتا ہے اور کن چیزوں سے احتیاط ضروری ہے، اور کن تدابیر کو اختیار کرنا ضروری ہے، آگے لکھتے ہیں: جب تم دشمن قوم سے اس کے کسی فرد سے ملو تو پوری چالاکی سے ملو، اور سختی سے پیش آؤ، ان کی قوم کے تماشہ دیکھنے میں مت لگ جانا، اس لئے کہ وہ ایک چالاک اور مکار قوم ہے، ان کو اپنی طرح سادہ مت سمجھنا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت عمر اپنے خطوط اس انداز سے لکھ رہے تھے ایسا لگتا تھا کہ آپ معائنہ فرما رہے ہوں، اور اپنے قائد کو ہدایت کر رہے ہوں۔ آگے لکھتے ہیں: قادسیہ یہ ایران میں داخل ہونے کا دروازہ ہے، ان لوگوں کی عام مادی ضروریات یہیں سے پوری ہوتی ہیں بڑا سرسبز و شاداب علاقہ ہے، پلوں اور نہروں سے گھرا ہوا ہے، لہذا جب قادسیہ پہنچ جاؤ تو اپنی فوجی چوکیاں اس کی گھاٹیوں میں قائم کرنا، اپنی جگہ سے مت ہٹنا، جمے رہنا، جب دشمن کو تمہاری آمد کا علم ہوگا تو ان میں ہل چل مچ جائے گی اور وہ پوری قوت سے تم پر حملہ آور ہوگا، اگر تم اس حالت میں اپنے دشمن کے مقابلہ میں جمے رہے تو پورا یقین ہے کہ تم ان پر غالب آجاؤ گے۔

مزید اپنے قائد کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اپنے لشکر کو مواعظ حسنہ سے نوازتے رہو، صبر کی تلقین کرو، اور بتاؤ کہ خدا کی طرف سے بقدر نیت مدد آتی ہے، اور ثواب بقدر خلوص عطا ہوتا ہے، اپنے ماتحت لوگوں کے تعلق سے احتیاط برتو اور اپنی ذمہ داری پر نظر رکھو، خدا سے عافیت کا سوال کرتے رہو، اور لاحول ولاقوۃ کا کثرت سے ذکر کرو، کسی بھی پیش آمدہ واقعے کی اطلاع مجھے لکھو۔

ان واضح ہدایات کے بعد حضرت سعد نے ایک دانشمند قائد کا کردار نبھاتے ہوئے ان پر عمل کیا اور ان ہدایات کو جنگ میں حضرت عمر کی موجودگی تصور کیا۔

حضرت سعد نے ایک خط لکھا اور اس میں مقام قادسیہ کی پوری تفصیل لکھی، فرمایا، السلام علیکم ورحمۃ اللہ یا امیر المؤمنین، قادسیہ خندق اور نہر عتیق کے درمیان ایک شہر ہے، اس کے بائیں جانب بحر اخضر ہے، جو حیرۃ تک دو راستوں سے پہنچتا ہے، ان میں ایک راستہ فراز کی جانب جاتا ہے اور دوسرا نشیب کی جانب، نشیب والے راستہ کو خصوص کہا جاتا ہے، اس راستہ پر چلنے والا اراگیر مقام خورنق تک پہنچتا ہے، اور یہ کہتے ہوئے اپنے خط کو مکمل کیا کہ وہ لوگ ہمیں مغلوب کرنا چاہتے ہیں، اور ہم ان پر فتحیاب ہونا چاہتے ہیں، نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے، تقدیر کا فیصلہ اٹل ہے، خدا کی جو منشا ہے وہ فیصلہ فرمائے گا، ہم اللہ سے بہتر نتائج کی دعاء کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ تقدیر کا فیصلہ ہمارے موافق ہو۔

حضرت عمرؓ حضرت سعد کو خط لکھا فرمایا: آپ کا خط موصول ہوا،

جب تک تمہارے دشمن میں کوئی حرکت نہ ہوتم اپنی جگہ جمے رہو، یاد رکھو اس موقع پر آئندہ کی کامیابیاں موقوف ہیں، اگر اللہ تمہارے دشمن کو پسپا کردے تو تم مدائن میں گھستے چلے جانا اور یقیناً مدائن کو تم فتح کروگے۔

حضرت سعدؓ مقام قادسیہ میں کافی عرصہ تک خاموش پڑاؤ ڈالے رہے، لیکن اہل فارس کی جانب سے کوئی حرکت نہیں ہوئی، لہذا حضرت عمر کو خط لکھا اور کچھ جاسوس حیرۃ کی جانب بھیجے تاکہ دشمن کی فوج کے کچھ احوال معلوم ہوسکیں، جاسوسوں نے آکر بتایا کہ حیرۃ کے بادشاہ نے رستم کو جنگ کا قائد بنایا ہے سعد نے یہ بات بھی بہت جلد عمرؓ تک پہنچائی، حضرت عمر کی جانب سے حوصلہ افزا جواب آتا ہے۔

عمر نے لکھا، ان کی جانب سے اپنے آپ کو بے فکر رکھو، خدا سے مدد مانگو اسی کی ذات پر بھروسہ کرو، اور کچھ اپنے لوگوں کو بطور قاصد رستم کے پاس بھیجو، جو لوگ وہاں جائیں، وہ عقلمند اور بھاری بھرکم جسم والے ہوں، جب وہ ان کو دیکھے تو اس پر رعب طاری ہو، تاکہ اس مغرور قائد کا نشہ ڈھیلا ہو، اور اپنے انجام کے بارے مین اچھی طرح سوچ لے۔

قارئین! ان نازک حالات میں خلیفہ الرسول حضرت عمر مدینہ میں رہ کر اپنے قائد حضرت سعد کی جو کہ فارس کے علاقہ میں تھے قیادت فرمارہے تھے، اور جنگ قادسیہ کا قائد خلیفہ کے خوابوں میں رنگ بھر رہا تھا، پوری سچائی اور دیانتداری کے ساتھ اپنے خلیفہ کی رائے کے مطابق کام کررہا تھا، کسی دنیوی غرض یا مادی مفاد کی خاطر اپنے خلیفہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کررہا تھا، بلکہ ایک فرمانبردار بہادر اور دوراندیش سپاہی و جنرل کا کردار نبھارہا تھا۔

حضرت سعدؓ نے چند بہادر، عقلمند اور بارعب حضرات کو رستم کے دربار میں بھیجا، نعمان بن مقرن، بشر بن ابی وہم، حنظلہ بن ربیع، مغیرۃ بن زرارۃ، اشعث بن قیس، عاصم بن عمرو، عمر بن معدیکرب، مغیرۃ بن سعید، مغنی بن حارثہ، یہ لوگ رستم کے دربار میں پہنچے، رستم نے ایک ترجمان کو بلایا اور کہا تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو، حضرت نعمان نے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا اور جواب دینے کی اجازت چاہی، صحابہ نے اجازت دے دی۔

حضرت نعمان نے اپنی بات شروع کی: اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر رحم فرماتے ہوئے ہمارے درمیان ایک ایسے رسول کو بھیجا، جو ہمیں بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے، برائی سے روکتا ہے، اور ان باتوں کو ماننے پر دنیا وآخرت کی بھلائی کا وعدہ کرتا ہے۔

حضرت نعمان نے دین کی اچھائیاں گنائیں، اور لوگوں کے داخل ہونے اور اسلام قبول کرنے کا حال بتایا، اور بتایا کہ ہمارے رسول کا مشن تمام قوموں کو اس دین کی دعوت دینا ہے۔

لہذا اے بادشاہ ہم تجھ کو بھی اس دین کی جانب بلاتے ہیں، یہ دین تمام اچھائیوں کو اچھا اور برائیوں کو برا کہتا ہے، اگر تم انکار کرتے ہو تو جزیہ قبول کرو، اور اگر جزیہ نہیں دینا چاہتے تو پھر جنگ ہمارا اور تمہارا فیصلہ کرے گی، اور اگر تم اس دین کو قبول کرتے ہو، تو ہم کتاب اللہ کو تمہارے درمیان چھوڑتے ہیں اور تمہیں اس کے احکام بتاتے ہیں تم اسی کے مطابق اپنے فیصلے کرو، پھر ہم یہاں سے لوٹ جائیں گے تمہارا ملک تمہارے حوالہ ہوگا۔

یہ بات سن کر بادشاہ یزدگرد غصہ سے پاگل ہوگیا، اور غضبناک لہجہ میں بولا، میں تم سے زیادہ بد بخت اور ذلیل قوم کو اس روئے زمین پر نہیں جانتا تم لوگ مٹھی بھر جماعت ہو۔

لیکن پھر بھی تمہیں غرور ہے، تمہیں ہماری طاقت کا اندازہ نہیں ہے، اس لئے دھوکہ میں پڑے ہوئے ہو، لیکن اگر تم بھوک سے پریشان ہوکر یہاں آئے ہو تو جاؤ ہمیں تمہیں اتنا غلہ وانا ج دیتے ہیں جو شکم سیر کردے تمہارے چہروں پر خوشحالی آجائے، تمہیں کپڑے بھی دے دیتے ہیں۔

حضرت مغیرہ بن زراۃ نے رستم کا بڑی بے باکی سے جواب دیتے ہوئے کہا: اے بادشاہ یہ عرب کے معزز ترین لوگ جو زیادہ بولنا پسند نہیں کرتے، لہذا انھوں نے وہ پورا پیغام تمہیں نہیں سنایا جس کو وہ نبی مبعوث لے کر آیا ہے اور نہ ہی تمہاری ساری باتوں کا جواب دیا، اور یاد رکھو ہم وہ نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو، سنو! اللہ نے

ہمارے درمیان ایک ایسے نبی کو مبعوث فرمایا ہے جس کے حسب و نسب کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں، لہذا اس کی ہر بات خدا کی بات ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے تمہارا رب تم سے یہ فرماتا ہے، میں اللہ ہوں میرا کوئی شریک نہیں جب کچھ نہ تھا تو میں تھا اور جب کچھ نہ رہے گا تو میں باقی رہوں گا، ہر چیز فانی ہے، صرف میری ذات باقی رہنے والی ہے، تمام معاملات میری جانب لوٹ کر آتے ہیں، میری رحمت نے تمہاری دستگیری کی اور تمہارے درمیان ایک نبی کو مبعوث فرمایا یہ نبی تمہیں ایک ایسے راستہ کا پتہ بتا رہا ہے جس پر چل کر تم موت کے بعد میرے عذاب سے بچ جاؤ گے، اور آخر میں کہا: اب تمہیں اختیار ہے کہ اپنی انا کے بت کو گرا کر یا تو اسلام قبول کرو، جس کی بنیاد پر تم اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے بچا سکتے ہو، یا پھر جزیہ دو، اور اگر یہ منظور نہیں تو پھر میدان میں آجاؤ تلوار ہمارے تمہارے درمیان حق و باطل کا فیصلہ کرے گی۔

رستم غصہ سے آگ بگولہ ہوگیا، آنکھیں سرخ ہوگئیں اور بولا تم لوگ میرے سامنے اس طرح پیش آرہے ہو، اگر قاصد کو قتل کرنا حرام نہ ہوتا تو میں تم سب کی گردنیں اتار دیتا، اور تم میرا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے، پھر یزدگرد نے اپنے دربانوں کو حکم دیا کہ مٹی کا بھرا ہوا ایک ٹوکرا لاؤ، اور ان میں جو سب سے زیادہ معزز ہے اس کے سر پر رکھ کر ان کو دربار سے نکال دو، پھر مغیرۃ اور آپ کے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوکر بولا تم لوگ یہاں سے نکلو میں رستم کو تمہاری سرکوبی کے لئے بھیجتا ہوں، وہ تم کو قادسیہ کی خندق میں گرفتار کرے گا، یزدگرد کا غصہ بڑھتا جارہا تھا، اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہورہا تھا، تیز آواز میں بولتا ہے، تم میں سب سے زیادہ معزز کون ہے، عاصم بن عمرو نے کہا: میں ان لوگوں کا سردار ہوں۔

رستم: اچھا تم ہو سید القوم، عاصم نے ہاں میں جواب دیتے ہوئے مٹی کا ٹوکرا اپنے سر پر رکھا، اور دیوان عام سے نکل گئے، سرپٹ گھوڑا دوڑاتے اور مٹی کا ٹوکرا اٹھائے حضرت سعد بن ابی وقاص کے دربار میں پہنچے اور سارا ماجرا کہہ سنایا اور ٹوکرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اے امیر بشارت قبول کر اللہ نے مملکتِ ایران کی چابیاں ہم کو دے دی ہیں۔

یزدگرد نے رستم سے اس نازک معرکہ کے تعلق سے بات کی اور کہا، ان لوگوں نے سچ کہا ہے اور جو یہ وعدہ کر کے گئے ہیں اس کو ضرور پورا کریں گے، رستم بھی غصہ سے بھڑک اٹھا اور ایک خونخوار درندے کی طرح دربار سے نکل آیا، مسلمانوں نے ایران کے اطراف میں چھاپہ ماری شروع کر دی تھی، اب رستم چالیس ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں سے مقابلہ کے لئے نکلا، میمنہ پر ہرمزان اور میسرہ پر مہران بن بہزام تھا۔ رستم چار مہینہ تک جنگ کو ٹالتا رہا اس کا یہ گمان تھا کہ مسلمان اکتا کر یہاں سے چلے جائیں گے۔

لیکن حضرت عمر نے سعد کو یہ حکم دیا کہ تم اپنی جانب سے جنگ کی ابتدا کرو حضرت سعد نے عاصم بن عمرو کو چند صحابہ کے ساتھ ایک جگہ رستم کی فوج پر حملہ کرنے بھیجا یہ لوگ وہاں سے کامیابی کے ساتھ مالِ غنیمت لے کر لوٹے۔

۱۴ھ میں رستم اپنے ایک لاکھ لشکر کے ساتھ کوفہ کے قریب شہر نجف پہنچا، یہیں سے جنگ قادسیہ کی ابتدا ہوئی، حضرت سعدؓ نے اپنے لشکر کو سورۃ انفال کی تلاوت کا حکم دیا، آیات جہاد سن کر مسلمانوں کے دل شوقِ جہاد میں مچل اٹھے،

حضرت سعد نے کہا: میں ظہر کی نماز کی ادائیگی کے بعد ایک تکبیر کہوں گا تم لوگ تیار ہوجانا اور پھر جب دوسری تکبیر کہوں اپنے ہتھیار سنبھال لینا، تیسری تکبیر پر مکمل طور پر چاق و چوبند ہوجانا، اور چوتھی تکبیر پر دشمن پر حملہ کر دینا، اور لاحول ولاقوۃ کا ورد اپنی زبانوں پر جاری رکھنا، چوتھی تکبیر پر جنگ شروع ہوجاتی ہے، ایرانی فوج کے ہاتھی مسلمانوں کے لئے بھاری پڑ رہے تھے، ان کے ڈیل ڈول سے مجاہدین کے گھوڑے بدک رہے تھے، ہاتھیوں نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی، مسلمان شہید ہو رہے تھے، ہاتھیوں کی غارت گری کو دیکھتے ہوئے چند نوجوان میدان میں نکلے اور ہاتھیوں پر تیروں سے حملہ کیا، اور انھیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، جس سے ایرانیوں کا زور ختم ہوا۔

یہ پہلے دن کی جنگ تھی جو ہاتھیوں کی وجہ سے مسلمانوں کے حق میں بڑی دشوار گزار رہی، اس دن کی جنگ کو جنگ ارماث بھی کہا

جاتا ہے، دوسرے روز حضرت سعد نے شہیدوں کو دفن کیا، دوسرے ہی دن شامی لشکر حضرت ابوعبیدہ کی قیادت میں عراق پہنچ گیا، جس کو خلیفہ الرسول حضرت عمرؓ نے حضرت سعد کی مدد کے لئے بھیجا تھا، دوسرے دن بھی گھمسان کا رن پڑا، آج مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔

تیسرے روز اہل فارس ہاتھیوں کے جھنڈ کے ذریعہ مسلم فوج پر حملہ آور ہوئے حضرت سعد نے ان کی آنکھوں میں نیزے مارنے کا حکم دیا اس مشن کو حضرت قعقاع اور ان کے بھائی عاصم بن عمرو نے اپنے ساتھ کچھ جانبازوں کو لے کر پورا کیا، اس تندہی کے ساتھ ہاتھیوں پر حملہ کیا کہ وہ اندھے ہوکر پیچھے پلٹنے لگے، اور الٹا ایرانیوں کے لئے وبال جان بن گئے، ایرانی فوج میں اب افراتفری مچ گئی، مسلمانوں کا پلہ بھاری ہوتا جارہا تھا، شام ہوجاتی ہے لیکن جنگ بند ہونے کا نام نہیں لیتی پوری رات حالت جنگ میں گزرتی ہے حضرت قعقاع صحابہ کے جذبہ کو سرد نہیں پڑنے دیتے تھے فرماتے بس چند لمحوں میں جنگ فیصلہ ہوا جاتا ہے، چند جیالوں نے ایرانی فوج کے قلب پر حملہ کیا اور رستم کے مرکز قیادت کو ہلا ڈالا، اب رستم گھبرایا اور بھاگنے کے لئے راستہ تلاش کرنے لگا کیوں مسلم فوج دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی رستم میدان چھوڑ کر بھاگا تو ایک عظیم مجاہد حضرت ہلال بن عتبہ نے اس کا پیچھا کیا، اس کو قتل کیا اور اس کی مسند پر کھڑے ہوکر بآواز بلند ایک ندا لگائی۔

رب کعبہ کی قسم میں نے رستم کو قتل کر دیا۔ رب کعبہ کی قسم میں نے رستم کو قتل کر دیا۔

رستم کے قتل کے بعد ایرانی فوج میں خوف و ہراس کی فضاء قائم ہوگئی، اب وہ مسلمانوں کے حملہ کی تاب نہ لا سکتے تھے، بدحواسی کے عالم میں ایک پل کی جانب ایرانی فوج بھاگی وہ پل بھی آگے ٹوٹا ہوا تھا مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر کے گرفتار کرلیا، یہ بھی ایک تاریخی دن تھا اور اس کو ''عماس'' کا نام دیا گیا، اس جنگ کے چوتھے دن کو قادسیہ کہا جاتا ہے، چوتھے دن مسلمانوں کو بہت جانی نقصان اٹھانا پڑا، تقریباً چھ ہزار مجاہدین شہید ہوئے جبکہ ایرانی فوج کے تیس ہزار لوگ قتل کئے گئے، شروع میں حضرت قعقاع نے میدان میں آکر مبارزت طلب کی، آپ کے مقابلہ کے لئے بہمن جاذویہ آیا، یہ وہی شخص تھا جس نے مسلمانوں کو یوم الحسر کے دن شکست دی تھی، قعقاع نے اسے دیکھ کر کہا آج تجھ سے پچھلا حساب چکتا کیا جائے گا، اس پر دیوانہ وار حملہ کیا اور چند ہی لمحوں میں وہ زمین پر ڈھیر تھا۔

حضرت قعقاع بن عمرو اور عاصم بن عمرو جنگ قادسیہ کے وہ ہیرو ہیں جن کے نام کو تاریخ نے محفوظ کیا ہے تاکہ آئندہ آنی والی نسلوں کے لئے ان کی داستان جہاد باعث فخر ہو۔

جنگ قادسیہ ختم ہوئی، مسلمانوں کو خوب مال غنیمت ملا، یہاں تک کہ ہر مجاہد کو چھ ہزار ایرانی نقود ملے، رستم کی پوشاک قیمتی جواہرات سے بنی ہوئی تھی، ایرانی پرچم تیندوے کی کھال کا بنا ہوا تھا اس کے کنارے پر جواہرات جڑے ہوئے تھے، جنگ قادسیہ اسلامی تاریخ کی عظیم فتوحات میں سے ہے۔

یزدگرد نے جنگ قادسیہ میں اپنی پوری طاقت جھونک دی تھی لیکن یہاں کی شکست کے بعد پرشین امپائر کبھی ابھر نہ سکا، اور نہ ہی مسلمانوں کی طاقت کے سامنے یہ لوگ ٹھہر سکے، بلکہ دھیرے دھیرے ان کے سارے مضبوط قلعے زمین بوس ہوگئے۔

ادھر مدینہ میں حضرت عمرؓ بے صبری سے جنگ قادسیہ کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے، ہر آنے والے کی جانب آپ دوڑ کر جاتے، ایک شخص گھوڑے پر سوار مدینہ کی جانب دوڑا چلا جا رہا ہے، حضرت عمر اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں اے اللہ کے بندے کیا تو قادسیہ کے بارے میں کچھ جانتا ہے، سوار اسی طرح شہر میں داخل ہوجاتا ہے، جب اس کو پتہ چلا کہ پیدل شخص امیر المؤمنین ہیں، اس نے کہا امیر المؤمنین اللہ آپ پر رحم فرمائے آپ نے بتا کیوں نہیں دیا کہ آپ ہی عمر ہیں۔

حضرت عمر فرماتے ہیں میرے بھائی اس میں کوئی حرج نہیں تم مجھے سعد کا خط سنادو، قاصد نے خط پڑھ کر سنایا جس میں قادسیہ کی فتح کی بشارت تھی مسلم مجاہدین کی تعریف بھی کہ یہ لوگ اسلام کے شیر ہیں، جن لوگوں نے شہادت پائی وہ شہادت کی فضیلت سے فیضیاب ہوئے ہیں، جو باقی ہیں وہ انہیں صفات کے مالک ہیں جو شہداء میں

پائی جاتی تھیں۔

اس جنگ میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا، ابومحجن ثقفی اس جنگ میں شریک تھے لیکن جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنے اشعار میں شراب کی تعریف کے جرم میں انھیں قید خانہ میں ڈال دیا گیا، جنگ کی خبریں ان تک پہنچ رہیں تھی، ابومحجن کو جنگ میں اپنے شریک نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا، لہذا یہ اپنے پیٹ کے بل چل کر حضرت سعدؓ کی خدمت میں پہنچے، حضرت سعد اپنی بیماری کی وجہ سے گھر کے بالائی حصہ پر بیٹھے ہوئے تھے، اور میدان جنگ میں مجاہدین کی رہبر فرما رہے تھے، ابومحجن حاضر خدمت ہوکر جنگ میں شرکت کی درخواست کرتے ہیں، لیکن حضرت سعد کچھ غور وفکر کے بعد انکار کر دیتے ہیں۔

ابومحجن واپس اپنی جگہ لوٹ آئے، ایک روز حضرت سلمٰی بنت حفصہ ان کے پاس سے گزریں یہ ثنی ابن حارثہ کی بیوی تھیں ان کے انتقال کے بعد حضرت سعد نے ان سے نکاح کر لیا تھا، ابومحجن نے ان سے کہا بنت حفصہ کیا آپ کوئی بھلائی کا کام کر سکتی ہیں۔

سلمٰی بنت حفصہ۔آپ کیا چاہتے ہیں۔

ابومحجن: آپ مجھے اس قید و بند کی صعوبت سے تھوڑی دیر کے لئے آزاد کر دیں اگر میں زندہ رہا تو خدا کی قسم جنگ کے بعد اپنے آپ کو دوبارہ قید خانہ کے حوالہ کر دوں گا، حضرت سلمٰی نے شروع میں انکار کیا اور ان کے مطالبہ کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ میری استطاعت سے باہر ہے۔

ابومحجن کی دل کی مراد جب پوری نہ ہوئی تو مارے غم کے بے ساختہ اشعار گنگنانے لگے۔

مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ جب گھوڑا سوار اپنے نیزوں کو لہراتے ہوئے میدان میں دادِ شجاعت دے رہے ہیں تو میں یہاں قید خانہ میں پڑا ہوا ہوں، جب میں کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہوں تو بھاری بھر کم زنجیریں مجھے روک دیتی ہیں اور دروازے بند ہو جاتے ہیں کہ مجاہدین کی للکار کی آواز بھی مجھ تک نہیں پہنچتی ہے۔ میں بڑے خاندان اور مال والا شخص تھا، لیکن آج مجھے ان لوگوں نے تنہا چھوڑ دیا ہے، میرا اللہ سے یہ عہد ہے اور میں عہد شکنی کبھی نہیں کروں گا کہ اگر آج میں آزاد ہو گیا تو کبھی شراب کی دکان کے پاس سے بھی نہیں گزروں گا، ابومحجن ان اشعار کو پڑھ رہے تھے۔

حضرت سلمٰی ان کے پاس آئیں اور عرض کیا کہ میں نے استخارہ کیا ہے اب میں تمہارے عہد سے متفق ہوں حضرت سلمۃ بنت حفصہ نے ابومحجن کو جنگی بیڑیوں سے آزاد کر دیا، ابومحجن حضرت سعد کے گھوڑے پر جس کو بلقاء کہا جاتا تھا سوار ہوئے اور اس طرح ایڑ لگائی جیسے کہ تیر کمان سے نکل کر جاتا ہے، میمنہ میں جا کر شامل ہو گئے ایک تکبیر کہی اور دشمنوں کے جمگھٹے میں گھس گئے کشتوں کے پشتے لگا دیئے، دشمن کے مقدمۃ الجیش کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، بعض لوگ کہہ رہے تھے یہ بلقاء پر کون سوار ہے، بلقاء تو سعد کا گھوڑا ہے اور سعد محل کے بالا خانہ پر بیٹھے فوج کی رہنمائی کر رہے ہیں، ابومحجن کے دیوانہ وار وار کو دیکھ کر لوگ محوِ حیرت تھے، کوئی کہتا بھائی یہ سوار کون ہے ہم نے تو اس سے پہلے نہیں دیکھا، کوئی کہتا اگر فرشتہ جنگ میں شریک ہوا کرتے تو یقیناً یہ سوار کوئی فرشتہ ہوتا، اچانک حضرت سعد کی نظر اپنے گھوڑے بلقاء پر پڑی جس پر کوئی سوار ہے اور اس نے دشمنوں کے چھکے چھڑا رکھے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ یہ ابومحجن ہے لیکن وہ تو قید ہے بالآخر شام ہوتی ہے ابومحجن قصر سعد کی جانب لوٹ آتے ہیں اور کسی کو علم بھی نہیں ہوتا گھوڑے کو وہیں باندھا جہاں وہ بندھا تھا اور قید خانہ کی کڑیاں اپنے ہاتھوں میں ڈال لیں، اور یہ اشعار کہے، اہلِ ثقیف کو پتہ چل گیا کہ ہم سب سے زیادہ شمشیر زنی کرنے والے ہیں، اور سب سے زیادہ زرہیں ہمارے پاس ہیں، جب لوگ میدان کارزار میں جم نہیں پاتے ہیں ایسے وقت ہم ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں، وہ لوگ قادسیہ کی رات مجھے پہنچانے سے قاصر رہے اور قید خانہ سے میدان جنگ میرے جانے کا کسی کو پتہ نہیں چلا اگر وہ لوگ مجھے قید رکھتے ہیں تو یہ میری آزمائش ہے اور اگر مجھے آزاد کرتے ہیں تو دشمن میری تلوار کا بار سنبھال نہیں پائے گا۔

حضرت سلمٰی نے کہا: ابومحجن! امیر نے تمہیں کیوں قید کیا ہے،

ابومحجن: خدا کی قسم میں نے کوئی حرام چیز نہیں کھائی، بلکہ زمانہ جاہلیت میں میں شراب کا عادی تھا، میں ایک نوجوان ہوں، میری زبان پر شراب کی مدح سرائی میں اشعار آ گئے، اور میں شعر کہہ بیٹھا۔

جب مجھے موت آجائے تو میری قبر انگور کی جڑ کے نزدیک بنانا تاکہ میری موت کے بعد بھی اس کی جڑیں میری ہڈیوں کو سیراب کرتی رہیں، مجھے کسی صحراء میں مت دفن کرنا کیوں کہ اس صورت میں میری ہڈیاں شراب سے محروم رہ جائیں گی۔

حضرت سعد حضرت سلمٰی بنت حفصہ سے ناراض تھے کیوں کہ ایک دن انھوں نے اس وقت واثنی کہہ حضرت مثنی کو یاد کیا جب کہ حضرت سعد اپنے بالا خانہ پر بیٹھے فوج کی رہنمائی کر رہے تھے، بہرحال حضرت سلمٰی نے حضرت سعد کو راضی کیا ان سے مصالحت کی پھر ابومحجن کا پورا واقعہ سنایا حضرت سعد نے ابومحجن کو بلا کر سینے سے لگایا اور ان کا قصور معاف کر دیا۔

حضرت سعد نے جنگ قادسیہ کے حالات حضرت عمر کو لکھ بھیجے حضرت عمر نے ان کو حکم دیا کہ اب کچھ دن تک آرام کرو اور فوج کو بھی آرام کا موقع دو، دو مہینہ کے بعد حضرت عمر نے حیرۃ کا رخ کرنے کا حضرت سعد کو حکم دیا، ذی الحجہ ۱۴ھ کو حضرت سعد نے حیرۃ کو بھی فتح کر لیا۔

حضرت سعد بن وقاص ملک فارس کے علاقوں کو فتح کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، اب آپ نے بھرسیر کا رخ کیا یہ مدائن کے قریب بغداد کا قریبی علاقہ تھا، مسلم فوج بھرسیر کی جانب زہرۃ بن الحویہ کی قیادت میں آگے بڑھ رہی تھی، راہ میں ایک ایرانی افسر شیراز سے ملاقات ہوئی یہ ایک علاقہ کا حاکم تھا، اس علاقہ کو ساباطِ کسریٰ کہا جاتا تھا، اس حاکم نے جزیہ پر صلح کر لی۔

زہرۃ بن الحویۃ ان کے ساتھ حضرت سعد کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ بھی ساتھ تھے، یہ لوگ ساباطِ کسریٰ پہنچ گئے اور یہیں پر حضرت سعد بھی پہنچے یہاں پر ایک علاقہ تھا جس کو مظلم کہا جاتا تھا، یہاں رہنے والے قبیلہ کو پوران کہا جاتا تھا، ان لوگوں نے یہ قسم کھائی تھی کہ ہم جب تک زندہ ہیں ملک فارس کے سایہ کو اپنی زمین پر نہیں پڑنے دیں گے۔

مسلمانوں کا لشکر مظلم علاقہ میں داخل ہوا ادھر کسریٰ نے ایک مقراط نامی شخص کو مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لئے بھیجا تھا، حضرت ہاشم نے اس کو قتل کر دیا، حضرت سعد نے اپنے بھتیجے ہاشم کو شاباشی دی اور ان کے سر کا بوسہ لیا، مسلمان پورے اطمینان سے مظلم میں خدا کے اس قول کو دہراتے ہوئے داخل ہوئے: اولم تکونوا أقسمتم من قبل مالکم من زوال..... امثال (٤٥)

بھرسیر اور اطراف کے علاقے فتح کرنے کے بعد حضرت سعد نے کشتی کا انتظام کرنا چاہا جس کے ذریعہ سے سمندر پار کر کے مدائن پہنچ جائیں لیکن انتظام ہو نہیں پا رہا تھا، اسی سوچ وفکر میں غرق تھے کہ ایک شخص آیا اس نے عرض کیا کہ میں آپ کو ایک ایسے راستہ سے لے جا سکتا ہوں جس سے آپ سمندری علاقہ سے بچ جائیں گے، لیکن حضرت سعد نے انکار کر دیا، اور اس کو واپس کر دیا، جب رات ہوئی تو حضرت سعد نے شاید استخارہ کیا۔ انھیں نظر آیا کہ مسلمانوں کے گھوڑوں نے سمندر پار کر لیا ہے، اس خواب کو دیکھنے کے بعد آپ نے سمندر کو عبور کرنے کا مکمل عزم کیا سب سے پہلے پوری فوج کو جمع کیا اور ایک تقریر کی۔ حمد وثنا کے بعد فرمایا:

بے شک تمہارا دشمن اس سمندر کی آڑ لے کر تم سے بچ رہا ہے، لیکن تم دشمن کے اس خیال کو غلط کر ڈالو تم اس بات سے چوکنا رہنا دشمن کبھی بھی اپنی کشتیوں کے ذریعہ تم پر حملہ کر سکتا ہے، میں یہ بھی کہتا ہوں کہ تم لوگ کسی انجانے خوف سے مت ڈرو، اس لئے کہ تم کو زمانہ اچھی طرح جانتا ہے، دشمن کی سرحدوں کو بند کر دو، اس کی تیاری کو ختم کر دو، میری رائے ہے کہ تم لوگ پورے اخلاص کے ساتھ جہاد کا عزم کر لو، میں تو اس سمندر کو پار کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہوں، عام لوگوں نے جواب دیا، اللہ ہمیں حق وہدایت کی خاطر عزمِ صمیم کی توفیق دے ہم حکم کی تعمیل کریں گے۔

حضرت سعد نے عرض کیا سب سے پہلے دجلہ میں داخل ہو دشمن کی جانب سے ہماری فوج کے لئے کون ڈھال بنے گا، حضرت عاصم بن عمر جو قادسیہ کے ایک جانباز سپاہی تھے، چھ سو مجاہدین کی ایک زبردست ٹکڑی لے کر سمندر میں کود پڑے یہ وہ فوجی تھے جس کو

ہمارے زمانہ میں آج اسپیشل فورس کہا جاتا ہے، حضرت سعد بھی ساٹھ مجاہدین کو لے کر سمندر میں گھس گئے، اپنی فوج کی جانب مخاطب ہوکر قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت کی، وما کان لنفس..... وسنجزی الشاکرین۔ (آل عمران: ۱٤٤)

آیت کا سننا تھا کہ پوری فوج نے سمندر میں گھوڑے ڈال دئے۔

دوسری جانب اہل ایران نے نہر دجلہ کو پار کرنا شروع کیا، عاصم بن عمرو نے اپنی فوج کو تیروں سے ان پر حملہ کا حکم دیا، ایران فوج کے قدم اکھڑ گئے اور پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئے۔ حضرت سعد نے لوگوں میں ایک ندا لگائی اور کہا خدا پر بھروسہ کرو اور اس سے مدد مانگو، اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل، لا حول ولا قوۃ إلا باللہ کا ورد کرتے رہو۔

محترم قارئین! کیا اس عزم وحوصلہ اور ایمان کی فولادی قوت کے سامنے خدا کی مدد نہ آتی، اور کیا باطل ٹھہر سکتا تھا، ہرگز نہیں، پوری مسلم فوج اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال چکی تھی، ایرانی بھی ہتھیار ڈال چکے تھے، حضرت سعد نے سلمان فارسی سے کہا جو کہ ان کے پہلو چل رہے تھے۔ سلمان! ہم لوگوں نے اپنے پیادوں کو سمندر میں ڈال تو دیا ہے اگر لشکر کسی برائی یا ظلم کا مرتکب نہ ہو تو یقیناً اچھائیاں برائیوں پر غالب آجائیں گی اور یہ سمندر بآسانی پار ہوجائے گا۔

حضرت سلمان نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا، خدا نے خشکی کے علاقہ کو ہمارے تابع کر دیا اب سمندر بھی ہمارے تابع ہوں گے، جس طرح ہمارے پیادے سمندر میں داخل ہوئے ہیں، اسی طرح فوج در فوج نکلیں گے بھی۔

کچھ ایرانی، لشکر کے خوف سے ڈر کر بھاگنے لگے، کچھ کو مسلمانوں نے گھیر کر قید کرلیا، اسلامی فوج بڑھتی بڑھتی کسریٰ کے محل قصر ابیض تک پہنچ گئی کچھ ایرانی وہاں قلعہ بند ہوگئے، مسلمانوں نے ان کو تین میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حکم دیا، اگر اسلام لے آؤ تو تم محفوظ ہو اور ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں، یا جزیہ اگر جزیہ سے انکار ہے تو پھر جنگ، یہاں تک کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا فیصلہ کردے۔

ان لوگوں نے جزیہ کو منظور کرلیا، حضرت سعد جیسے ہی مدائن میں داخل ہوئے کسریٰ کے محل کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے، بدن پر لرزہ طاری تھا، اور آنکھوں سے اشک جاری تھے۔

حضرت سعد ایوان کسریٰ میں داخل ہوئے صبح کی نماز پڑھی کسری کے تمام مال ومتاع کو جمع کیا جو تقریبا بارہ ہزار درہم ودنانیر پر مشتمل تھا، مدائن کے محلات کو مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا، مالِ خمس کو جمع کیا اس سے کسریٰ کے کپڑے زیورات کو جمع کیا اور پھر چمکتی دمکتی خوبصورت چیز کو حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کر دیا، تاکہ مسلمانوں کی فتح سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملے ایک ساٹھ گز کی چادر بھی بھیجی جس میں کسریٰ کی سلطنت کا نقشہ بنا ہوا تھا، اس کو جواہرات سے مرصع کیا گیا تھا، حضرت عمر لوگوں میں خمس کی تقسیم کے بعد اس قیمتی چادر پر کھڑے ہوئے اور کچھ لوگوں سے کہا کہ تم لوگ اسی چادر کو لے لو لیکن سب نے انکار کیا، آخر میں حضرت علی کھڑے ہوئے اور عرض کیا امیر المومنین اللہ آپ کے علم کو مزید بڑھائے، آپ کے یقین کو پختہ کرے، دنیا میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو بھی دیا آپ نے اس کو استعمال کیا، آپ نے جو پہنا اس کا حق ادا کیا، جو کھایا اس کو تمام کیا، اگر آج آپ نے ان لوگوں کی بات مان لی تو کل آپ کے سامنے وہ لوگ آئیں گے جو اپنا استحقاق ثابت کریں گے، حالانکہ وہ مستحق نہیں ہوں گے۔

حضرت عمر نے فرمایا علی تم سچ کہتے ہو آپ نے میری خیر خواہی کی، پھر اس کے ٹکڑے کیے اور لوگوں میں تقسیم کردیئے۔

حضرت عمر نے ایران کی ریاست کا امیر حضرت سعد کو بنایا، حضرت سعد پر ملت اسلامیہ کا ہر فرد ناز کرتا ہے۔

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

معاشرتی معاملات میں اللہ اور رسول کی اطاعت

احراز الحسن جاوید. ایم. اے
فورٹ انکلو، علی گڑھ

معاشرت اجتماعی طور پر مل جل کر رہنے کو کہتے ہیں جہاں کسی انسانی آبادی کے لوگوں کو ایک دوسرے سے سابقہ اور واسطہ پڑتا ہو، ظاہر ہے جہاں لوگ مل جل کر ایک ساتھ زندگی گزاریں تو آپس میں تعلقات بھی قائم ہوں گے اور جہاں تعلقات ہوں گے وہاں تعلقات کو جوڑے رکھنے اور بگڑنے سے بچانے کے لیے ضابطے اور طریقے بھی ہوں گے۔ ضابطوں اور طریقہ کی پابندی کرنے سے ہی ایک اچھا معاشرہ تشکیل پاتا ہے، ضابطوں اور طریقوں کا ہی دوسرا نام شریعت اور قانون ہوتا ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی ضابطے اور قانون کے بجائے اپنی خواہشات کے مطابق من مانی زندگی گزارنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ دنیاوی قانون کے بھی مجرم ہوتے ہیں اور شریعت کے بھی۔

اس دنیا میں دو طرح کے قوانین پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ قانون جسے سارے انسانوں اور پوری کائنات کے خالق و مالک اور احکم الحاکمین نے انسانوں کے لیے اپنے رسولوں کے ذریعہ بھیجا ہے، جس کے بارے میں اس نے یہ بھی بتایا کہ چونکہ وہ سب کا بنانے اور پرورش کرنے والا ہے اور ساری کائنات کا علم رکھتا ہے، اس سے زیادہ علم رکھنے والا دنیا کی کسی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں بھی نہیں پایا جاتا اس لیے اس کا بنایا ہوا قانون ہی مکمل اور سب سے بہتر اور تمام انسانوں کے لیے فائدہ مند ہے جو دنیا کی خرابیوں سے بھی بچاتا ہے اور مرنے کے بعد بھی اسے بہترین زندگی عطا کرے گا۔ یہ ایک بنیادی نکتہ ہے جو دنیا کے بیشتر لوگ نہیں جانتے جسے بتانے اور سمجھانے کے لیے اس کے خالق و مالک نے جب سے انسانوں کو زمین پر بسایا ہے اس وقت سے آج تک وہ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بتاتا رہا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے قانون کو اللہ کے آخری رسول نے اس پر پوری طرح چل کر دکھایا اور معاشرہ پر اس کے اصول وقوانین مکمل طور پر نافذ کر کے دنیا کو عدل وانصاف اور امن وسکون کا معیاری نمونہ دکھا دیا۔ لیکن بعد میں خود اس کے ماننے والے مسلمانوں کی اپنی نادانیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے یہ خدائی قانون عملاً ختم ہوگیا اور آج مکمل طور پر کہیں نہیں پایا جاتا، البتہ اس کے نشانِ راہ اور تاریخ آج بھی محفوظ ہے، اس کے برعکس خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں اس کے نافرمان بندوں کا بنایا ہوا دوسرا قانون بھی پایا جاتا ہے جو خدائی ہدایات کو نظر انداز کر کے بنایا گیا ہے، جس کا سرچشمہ شیطانی اور ابلیسی دماغ اور اس کے علوم وفنون ہیں، جو انسانوں کی صحیح رہنمائی نہیں کرتے بلکہ اسے فطری راہ سے ہٹا کر بہت دور لے جاتے اور دنیا میں فتنہ وفساد برپا کرتے ہیں، دنیا کے لوگوں کو شیطان نے اس غلط فہمی میں ڈال رکھا ہے، کہ چونکہ ان

کے پاس علم اور عقل ہے، اس لیے وہ انسانوں کے لیے قانون بنا سکتے ہیں اور اپنے طریقوں سے دنیا کی اصلاح بھی کر سکتے ہیں، ایسے لوگ اپنی دانشوری کے زعم میں فساد کو اصلاح سمجھتے ہیں، ان کی حقیقت قرآن پاک نے اس طرح بتائی کہ:

واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض، قالوا انما نحن مصلحون، الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون، (بقرہ: ۱۱-۱۲)

جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انھوں نے یہی کہا کہ ''ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں''، خبردار، حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں۔

انسانوں کے بنائے قوانین ہی آج دنیا میں سکہ رائج الوقت کی طرح چل رہے ہیں، اسی لیے ساری دنیا فساد و بگاڑ سے بھر گئی ہے۔ جس کا علاج دنیا کے پاس نہیں، بلکہ ہر نئی تدبیر، طریقہ اور قانون بگاڑ میں اضافہ ہی کرتا چلا جا رہا ہے، ارشاد ربانی ہے:

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون، (الروم: ٤٠)

خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا شاید کہ وہ باز آجائیں۔

یہ بگاڑ اور فساد جس کی وجہ سے نئی نئی برائیاں اور بیماریاں جنم لے رہی ہیں، اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب دنیا میں انسانی قوانین کی جگہ اس کے خالق اور احکم الحاکمین کے قوانین، اصول اور ضابطے نافذ کیے جائیں۔

معاشرہ کی ابتدا خاندان سے ہوتی ہے اور خاندان کی شروعات بیوی سے ہوتی ہے، دنیا میں سب سے پہلے جو رشتہ قائم ہوا وہ بیوی کا تھا، ورنہ حضرت آدم اس سے پہلے صرف مرد تھے جن کا کوئی باپ تھا نہ ماں، شوہر بھی اس وقت بنے جب اللہ نے ان کے لیے بیوی بنائی، اس کے بعد ہی دوسرے تمام رشتے ماں، باپ، بھائی بہن وغیرہ عالم وجود میں آئے، خالق کائنات نے اپنے کلام پاک میں ایک پوری سورہ ''النساء'' کے نام سے نازل فرمائی جس کے معنی عورتوں اور بیویوں دونوں کے ہوتے ہیں، اس سورہ کی ابتدائی آیت اور اس کے علاوہ سورہ آل عمران آیت: ۱۰۲، سورہ احزاب کی آیات: ۷۰، ۷۱ بھی آپ ﷺ خطبہ نکاح میں پڑھا کرتے تھے، یہ آیات درحقیقت معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کا بنیادی ذریعہ ہیں، ان آیات کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

''اے انسانو! اپنے رب سے ڈرو اور اس کی نافرمانی سے بچو جس نے تم کو ایک متنفس سے پیدا کیا، اسی متنفس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد عورت دنیا میں پھیلا دیئے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس کے ذریعہ تم (اپنا حق) ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور رشتوں کا پاس ولحاظ کرو، یقیناً اللہ تم پر نگراں ہے'' النساء:۱) ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی نافرمانی سے بچو جیسا کہ اس سے ڈرنے اور نافرمانی سے بچنے کا حق ہے اور تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر یہ کہ تم مسلم (اللہ کے فرنبردار) ہو''۔ (آل عمران:۱۰۲)

''اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو، اس کی نافرمانی سے بچو اور (ہمیشہ) سیدھی، سچی بات کہو، اللہ تمہارے اعمال درست فرمادے گا، تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا عظیم الشان کامرانی سے ہمکنار ہوگا۔ (احزاب: ۷۰، ۷۱)

خدا کی اطاعت کی بنیاد تقویٰ پر ہے جس پر اعمال صالحہ کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور تقویٰ اللہ کی نافرمانی سے بچنے کا نام ہے، جن کے دلوں میں اپنے خالق و مالک کو پہچاننے اور ماننے کا جذبہ اور طلب ہوتی ہے، قرآن پاک انہیں متقی قرار دیتا ہے۔ اللہ نے اپنی کتاب مقدس کی ابتدا ھدی للمتقین سے کی ہے، یعنی خدا سے ڈرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے والے ہی اس کی رہنمائی قبول کر کے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔

ارحم الراحمین اور احکم الحاکمین کی اطاعت کرنے کے لیے اس کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر سچے دل سے ایمان لانا اور ان کی پیروی کرنا لازم ہے اس لیے کہ خدا کے حکم پر عمل کا طریقہ اس کے رسول کے سوا کوئی دوسرا نہیں بتا سکتا۔

قرآن پاک بار بار انبیاء کی اطاعت کا حکم دیتا ہے، ان کے بتائے ہوئے طریقے کو صراط مستقیم کہتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ دنیا کے تمام مفکرین، مقننین، دانشور اور فلاسفر اور رہنماؤں کا اتباع چھوڑ کر صرف اپنے رب اور اس کے پیغمبر کا اتباع کرو!

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیاء (اعراف: ۲)

لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

اپنے رسول اور پیغمبر کی اطاعت کا حکم بھی خدا نے ہی دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن الله (النساء: ٦٤)

ہم نے جو بھی رسول بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ خدا کے حکم سے اس کی پیروی کی جائے۔

یہ بھی فرمایا:

من یطع الرسول فقد اطاع الله (النساء: ۸۰)

ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں اطاعت رسول پر زور دیا گیا، سورہ احزاب میں فرمایا:

لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة

بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔

رسول پر ایمان ہی وہ چیز ہے جو تمام انسانوں کو ایک عقیدہ پر جمع کر کے انھیں باہم مربوط کر سکتی اور ان کے اندر محبت و اخوت اور اتحاد پیدا کر سکتی ہے، دوسرا کوئی نظریہ اور فلسفہ نہ تو سارے انسانوں کو آپس میں جوڑ سکتا ہے اور نہ انھیں آخرت کے بڑے عذاب سے بچا سکتا ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان نہ لانے کا نتیجہ اور انجام بھی خالق کائنات نے دنیا والوں کو بتا دیا اور دکھا بھی دیا ہے:

وکاین من قریة عتت عن أمر ربها ورسله فحاسبناها حسابا شدیدا، وعذبنها عذابا نکرا، فذاقت وبال امرها وکان عاقبة امرها خسرا، (الطلاق:۸،۹)

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت حساب لیا اور انھیں بڑی بری سزا دی جس سے انھوں نے اپنے کیے کا مزہ چکھ لیا اور آخر کار ان کا انجام نامرادی رہا۔

مذکورہ بالا سطور میں بتایا گیا کہ معاشرہ کی بنیادی اکائی خاندان ہے۔ ایک خاندان میں آدمی کے سب سے قریبی رشتہ دار اس کے والدین اور بیوی بچے ہوتے ہیں، سب سے پہلے آدمی پر والدین کے حقوق واجب ہیں اس لیے کہ وہی اسے دنیا میں لانے کا ذریعہ بنے۔ اس کے بعد بیوی سے اچھا برتاؤ، مہر کی خوشدلی سے ادائیگی،

بچوں کی اچھی تربیت یہ سب مرد کے فرائض ہیں، ان کے بارے میں بروز قیامت اس کا حساب ہونا ہے، بیوی شوہر کے گھر اور مال کی نگراں اور بچوں کی تربیت کی اصل ذمہ دار ہے، اس کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا، اس کے بعد ایک خاندان سے قریب تر ان کے پڑوسی ہوتے ہیں، ایک مسلمان پر سب سے پہلے اپنی ذات اور خاندان کی اصلاح اور تعمیر ضروری ہے، اس کے بعد اصلاح و تعاون کا سب سے زیادہ حق دار اس کا پڑوسی ہوتا ہے، ہمسائے کے بڑے حقوق اسلام نے بتائے ہیں، قرآن میں ارشاد ہے:

والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب، (النساء:٣٦)

پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے پہلو کے ساتھی سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔

قرآن نے پڑوسیوں کی تین قسمیں بتائی ہیں، سب سے پہلے وہ پڑوسی جو ہمسایہ بھی ہے اور رشتہ دار بھی، دوسرا وہ جو اجنبی اور بیگانہ ہے، خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، صحابہ کرام جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو ان کے پڑوسی زیادہ تر یہودی تھے، جن کا وہ بہت خیال رکھتے، ایک اور نوعیت پڑوسی کی قرآن نے بیان کی جو بظاہر پڑوسی نہیں معلوم ہوتا بلکہ تھوڑی دیر کے لیے اس کا ساتھ اور رفاقت ہوتی ہے، یہ رفاقت سفر میں بھی ہوسکتی ہے، کھیل کود اور کلاس روم میں بھی، کسی خارخانہ اور فیکٹری میں کام کرنے والے ملکر اور دفتر میں دو کلرکوں کے درمیان بھی ہوسکتی ہے، اس کو بھی اللہ نے پڑوسی کا درجہ دیا اور پہلو کا ساتھی قرار دے کر اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے۔

اللہ کے آخری رسول ﷺ نے پڑوسیوں کے ساتھ ناروا سلوک کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ ایمان ہی نہیں رکھتے، صحابہ کرامؓ کے ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: ''خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں (تین بار تاکیداً یہ الفاظ فرمائے) صحابہ نے پوچھا کون یا رسول اللہ؟ فرمایا: وہ جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہو۔ (صحیح بخاری، کتاب الادب)

پڑوسیوں میں باہمی محبت اور الفت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ آپس میں تحفوں کا لین دین ہے، ان تحفوں کو بھیجنے اور لینے کا زیادہ موقع خواتین کو ملتا ہے، اس لیے آپ نے خاص طور پر عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں سے کوئی اپنی پڑوسی کو حقیر نہ سمجھے۔ تحفہ بھیجو خواہ وہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو، یعنی چھوٹے سے چھوٹے ہدیے کو بھی لینے اور دینے سے پرہیز نہ کرو۔ (صحیح بخاری)

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں، صدقہ وخیرات بھی خوب کرتیں مگر زبان کی تیز تھیں، اپنی زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں، لوگوں نے ان کا حال آپ سے بیان کیا تو آپ نے فرمایا ان میں کوئی نیکی نہیں وہ جہنم میں ڈالی جائے گی، صحابہ نے ایک دوسرے عورت کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں اور معمولی صدقہ وخیرات دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہیں تھیں، ان کے بارے میں آپ نے فرمایا یہ بی بی جنتی ہوگی (ادب المفرد، بخاری)

بلاشبہ سارے پڑوسی اچھے نہیں ہوتے، برے بھی ہوتے ہیں جن سے ہمیں رنج وتکلیف پہنچتی ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ کیا رویہ اور برتاؤ کرنا چاہیے؟ علامہ شبلی نعمانی نے ''سیرت النعمان'' میں امام ابوحنیفہ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے اس کی تلخیص اپنے لفظوں میں بیان کر رہا ہوں، اس میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے:

''امام صاحب کے پڑوس اور محلّہ میں ایک موچی رہتا تھا جو

نہایت عیاش اور رنگین مزاج تھا۔ دن بھر مزدوری کرتا اور جو کماتا اس سے بازار سے شراب لاکر راتوں میں راگ ورنگ کی محفل جماتا اور صبح تک خوب گانا بجانا اور شور شرابا ہوتا، امام صاحب راتوں میں عبادت اور ذکر وفکر میں مشغول رہتے جس میں اس کی وجہ سے بڑا خلل پڑتا، مگر اپنے اخلاق اور پڑوسی کے ساتھ صلہ رحمی کے سبب خاموش رہتے، ایک دن شہر کا کوتوال ادھر سے گزرا، اس نے جب یہ شور وہنگامہ دیکھا تو اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ صبح کو امام صاحب نے اپنے دوستوں سے تذکرہ کیا کہ رات ہمارے ہمسایہ کی آواز نہیں آئی، تو لوگوں نے رات کا ماجرہ بیان کیا، انھوں نے فورا سواری منگائی اور دربار کے لیے روانہ ہوگئے، یہ عباسیوں کا عہد حکومت تھا، عیسیٰ بن موسیٰ کوفہ کا عامل (گورنر) تھا۔ دربار پہنچنے کے بعد لوگوں نے اسے اطلاع دی کہ امام ابوحنیفہ آپ سے ملنے آئے ہیں، جب ان کی سواری قریب آئی تو وہ ادب وتعظیم سے پیش آیا اور انھیں لاکر عزت سے بٹھایا اور پوچھا آپ نے کیسے آنے کی تکلیف کی، مجھے بلا لیتے میں خود حاضر ہوجاتا، امام صاحب نے فرمایا ہمارے محلّہ اور پڑوس میں ایک موچی رہتا تھا کوتوال نے اسے گرفتار کرلیا ہے، میں چاہتا ہوں اس کو رہا کر دیا جائے۔ عیسیٰ نے اسی وقت داروغہ جیل کو حکم دیا اور وہ رہا کر دیا گیا۔ موچی امام صاحب کے اس برتاؤ سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنی عیش پرستیوں سے توبہ کر کے ان کے حلقہ درس میں بیٹھنے لگا اور رفتہ رفتہ فقہ میں مہارت حاصل کر کے ایک بڑا فقیہ بن گیا۔

بے پردگی، بے حیائی، زنا اور چوری معاشرہ کی ایسی گھناؤنی اور مہلک برائیاں ہیں جو پورے سماج کو گندہ اور اس کے امن وسکون کو غارت کر دیتی ہیں، اسی لیے شریعت نے ان جرائم کی سزا بھی بڑی سخت رکھی ہے۔ لیکن یہی برائی اگر ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے ساتھ کرے تو اس کی شناعت اور قباحت دس گنا بڑھ جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''زنا حرام ہے، اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے، چوری حرام ہے، خدا اور رسول نے اسے حرام ٹھہرایا ہے لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے ہمسایہ کے گھر چوری کرے۔ (ادب المفرد، بخاری)

مادہ پرستی کے اس دور میں ایک بھیانک معاشرتی جرم مختلف اشیاء میں ملاوٹ کا ہے، یہاں تک کہ مریضوں کو شفا دینے والی دوائیں بھی نقلی بنائی جارہی ہیں، شاید ہی کوئی چیز خالص ملتی ہو، یہ بھی ایک طرح کی صرف چوری ہی نہیں بلکہ دھوکہ اور فریب بھی ہے، یہ جرم کرنے والے ملک وملت کے غدار ہیں، یہ ایک بڑا گناہ اور پاپ ہے جس سے ہر انسان اور خاص طور پر مسلمانوں کو اس سے پرہیز ہی نہیں بلکہ اس جرم کو انجام دینے والوں کو اس سے باز رکھنے کی بھرپور جدوجہد کرنی چاہیے۔

اگر سارے مسلمان صرف اپنے گھر اور خاندان اور پڑوس کی اصلاح اور تعمیر میں لگ جائیں اور اس معاملے میں آنے والی دشواریوں اور رکاوٹوں کو اپنی حکمت اور تدبیر سے دور کرتے رہیں تو پورا سماج اور معاشرہ بہترین انداز میں تشکیل پاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا کرے۔

☆☆☆

❑ فقہی مباحث (آخری قسط)

بین مذہبی مذاکرات-اصول وآداب

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ

دیگر مذاهب کے مذهبی رسوم و اعمال میں شرکت کا حکم:

باہمی مذاکرات اور خوش گوار تعلقات نیز مذہبی تشدد اور منافرت کو دور کرنے کی غرض سے بھی دیگر اہل مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کرنا از روئے شرع جائز نہ ہوگا۔ البتہ وہ مسلمان جو پولس اور انتظامیہ میں ہیں اگر مذہبی تہوار کے موقع پر ان کی تعینات ہوتی ہے اور ان مواقع پر ان کی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے تو پھر مجبوری کی صورت میں ان حضرات کے لئے ان خدمات کا انجام دینا اور حفاظت اور نگرانی کرنا جائز ہوگا البتہ یہ یاد رہے کہ یہ حضرات بھی صرف نگرانی اور حفاظت کی حد تک اپنی ڈیوٹی انجام دیں گے۔ ان مذہبی رسوم میں شرکت اور اور حاضری اور اس کی طرف میلان یہ کسی طرح جائز اور درست نہ ہوگا۔ قرآن مجید صاف اعلان کرتا ہے۔ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان اور لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ غیر مسلموں کے تہوار ان کے مذہبی تصورات پر مبنی ہوتے ہیں اس لیے اس میں شرکت یا اس میں کسی طرح کا تعاون جائز نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

غیر مسلموں کے تہوار ظاہر ہے کہ ان کے مشرکانہ اعتقادات پر مبنی ہوتے ہیں، اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے شرک سے براءت اور بے تعلقی کا اظہار ضروری ہے، اس لیے ان تہواروں میں مسلمانوں کا شریک ہونا جائز نہیں، فقہاء نے بھی بہت سختی کے ساتھ اس سے منع فرمایا ہے۔ فتاویٰ بزازیہ میں ہے "الخروج إلى نيروز المجوس والموافقة معهم فيما يفعلونه فى ذلك اليوم كفر" (کتاب الفتاویٰ جلد ۱، ص ۳۰۵)

روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مسلمانوں نے ایرانیوں کے طرز پر موسم بہار کی آمد اور اس موسم کے اختتام پر تہوار منانے کی اجازت چاہی لیکن آپؐ نے اجازت نہیں دی (مشکوۃ المصابیح) نیز دیگر مذاہب کے تہوار اور مذہبی رسوم میں شرکت غیر مسلم اقوام سے مماثلت بھی ہے، سورج نکلنے، ڈوبنے اور نصف النہار کے وقت نماز پڑھنے سے منع کیا گیا، کیوں کہ آفتاب پرست قوم اور دوسری قوموں میں عبادت اور پوجا پاٹ کا خصوصی وقت ہے۔ یہاں غور کرنے کی بات ہے جب اسلام کو غیر مسلموں کے تہواروں سے یہاں تک کہ ان کی عبادتوں کے اوقات سے بھی مماثلت گوارا نہیں تو ان کے تہواروں میں شرکت کیسے جائز ہوسکتی ہے؟ کچھ لوگ اس کے لئے جواز فراہم کرتے ہیں کہ مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کے لئے ان کے تہواروں میں شرکت کی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن میرے خیال میں یہ کج فہمی اور ناسمجھی کی بات ہے، رواداری اور ہم آہنگی نیز خوش گوار تعلقات کے لئے بھی اس کی قطعا گنجائش نہیں ہوگی۔ رواداری ''مذہب فروشی'' کا نام نہیں یہ تو بے ضمیری کی بات ہوگی، رواداری اپنے عقیدہ اور مذہب پر رہتے

ہوئے دوسروں کو انگیز اور برداشت کرنا اور دوسری قوموں کے مذہبی خیالات میں عدم مداخلت کی پالیسی پر قائم رہنے کا نام ہے۔ (مستفاد کتاب الفتاویٰ جلد ا، ص ۳۰۶)

خلاصہ یہ کہ باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لئے بھی دیگر اہل مذاہب کے مذہبی رسوم و اعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کی اجازت نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ہم آہنگی کی خاطر مسلمانوں کا متوارث تہذیب کو چھوڑنا کیسا ہے؟

میری نظر میں آنحضرتؐ کی مکی اور مدنی زندگی نیز صحابہ کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کی روشنی میں محض خوشگوار تعلقات اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے شریعت کے اعمال خواہ ان کا تعلق واجبات و فرائض سے ہو یا سنن و مستحبات سے یا وہ اعمال مسلمانوں کی متوارث تہذیب و ثقافت سے ہو، جس نے مسلم معاشرہ میں شعار اسلام کا درجہ اختیار کر لیا ہو ایسے اعمال و شعار کو ترک کرنا شرعاً درست نہ ہوگا۔ البتہ اگر مسلمانوں کے ان متوارث تہذیب و ثقافت کے اختیار کرنے سے یقینی فتنہ و فساد مچتا ہو اور غیر مسلم ممالک میں وہاں کی حکومت مسلمانوں کو ان کے چھوڑنے پر مجبور کرتی ہو اور وہاں کے ایوان میں اس کے خلاف قرارداد منظور کرالی ہو تو ایسی صورت میں ایسے غیر مسلم ممالک میں جو کہ دارالحرب کے حکم میں ہے مسلمانوں کے لیے وقتی طور پر ان متوارث تہذیب و ثقافت کا (جو شرعاً واجب نہ ہو)، ترک کرنا اور چھوڑنا جائز اور درست ہوگا۔ شریعت مطہرہ کا اصول قرآن وحدیث کی روشنی میں ایسے موقع پر نرمی اور آسانی کا ہے۔ چنانچہ فقہاء کے یہاں اس کے لئے متعدد قواعد اور اصول موجود ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ (إذا ضاق الامر اتسع" "الضرر يزال" الضرورات تبيح المحظورات، الحاجة تنزل منزلة الضرورة، الحرج مرفوع شرعا۔

لیکن مسلمانوں کا ان متوارث تہذیب و ثقافت کا چھوڑنا جز وقتی ہوگا دائمی نہیں ہوگا۔ اور ان ملکوں میں ان مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی کہ حکومت سے گفت و شنید کے ذریعہ اپنے مطالبات کو منوائیں اور دیگر جمہوری ملکوں کے قوانین کا حوالہ بھی دیں۔ لیکن مسلمانوں کا از خود محض اس بنیاد پر ان اعمال اور تہذیب و ثقافت کا ترک کرنا کہ اگر ہم غیروں کے رنگ اور ڈھنگ میں رنگ کر رہیں گے تو ان کو دعوت دینا آسان ہوگا اور مدعو کے تالیف قلب کا سبب بنے گا، اور اس کے لئے غیروں کی تہذیب لباس اور کلچر کو اپنانا خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ ہو گمراہی والا عمل اور سوچ ہے اکبر نے یہی سوچ کر غیر مسلموں کی تہذیب کو اپنانے کی کوشش کی تھی اور اس زمانے کے علماء سوء نے اس کی تائید کی تھی اور اس کے لئے راہ ہموار کی تھی جس کا نتیجہ کیا ہوا، وہ کسی صاحب علم سے مخفی اور پوشیدہ نہیں۔ دین اکبری کا وجود ہوا اور شریعت اسلامیہ کی اینٹ سے اینٹ بجائی گئی۔ آج بہت سے علماء جو اپنے کو روشن خیال اور روشن ضمیر سمجھتے ہیں اس طرح کی ناسمجھی اور کج فہمی کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

میں اپنے اس موقف کی تائید میں حضرت حذیفہؓ کے اس واقعہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جب شاہِ ایران نے لڑائی سے قبل مذاکرات کے لیے آپ کو اپنے دربار میں بلایا تو اس موقع پر شاہ ایران نے آپ کے کھانا کے لئے زبردست انتظام کیا تھا چنانچہ جب آپ نے کھانا شروع کیا تو کھانے کے دوران آپ کے ہاتھ سے ایک نوالہ نیچے گر گیا۔ جب نوالہ گرا تو حضرت حذیفہ سے اس نوالے کو اٹھانے کے لئے نیچے ہاتھ بڑھایا، آپ کے برابر ایک صاحب بیٹھے تھے انہوں نے آپ کو کہنی مار کر اشارہ کیا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ یہ دنیا کی سپر طاقت کسریٰ کا دربار ہے، اگر تم اس دربار میں ایسا کروگے تو یہ سمجھیں گے کہ یہ بڑے گھٹیا قسم کے لوگ ہیں، اس لیے یہ نوالہ اٹھا کر کھانے کا موقع نہیں ہے، آج اس کو چھوڑ دو۔

جواب میں حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے عجیب و غریب جملہ ارشاد فرمایا کہ:

"أتركت سنة حبيب لهولاء الحمقىٰ" کیا میں ان احمقوں کی وجہ سے سرکار دو عالم ﷺ کی سنت چھوڑ دوں؟۔

تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں حضرت عثمانؓ کا واقعہ بھی موجود ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ

ﷺ نے کچھ معاملات طے کرنے کے لئے قریش کے پاس اپنا قاصد اور ایلچی بنا کر حضرت عثمانؓ کو روانہ کیا۔ حضرت عثمانؓ نے رات اپنے چچازاد بھائی کے یہاں گزاری اور صبح کو قریش کے سرداروں سے گفتگو کے لیے چلے۔ اس موقع پر آپ کا پائجامہ ٹخنوں سے اوپر آدھی پنڈلی تک تھا۔ حضرت عثمانؓ کے بھائی نے کہا جناب عربوں کا طریقہ اور دستور یہ ہے کہ جس شخص کا ازار اور تہبند جتنا لٹکا ہوا اتنا ہی اسکو بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے۔

اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ اپنا پائجامہ نیچے کر لیں ورنہ مذاکرات میں جان نہیں پڑے گی، اور ان کی نظروں میں آپ کی اہمیت اور وقعت نہیں ہوگی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے چچازاد بھائی کو جو جواب دیا اس میں ہم سب کے لئے عبرت ہے اور اس سوال کا صحیح جواب بھی۔ لا هكذا ازارة صاحبنا ﷺ نہیں میں اپنا ازار اس سے نیچا نہیں کر سکتا، میرے آقا ﷺ کا ازار ایسا ہی ہے،

مذاهب باطله پر تنقید کے حدود:

اسلام کی پاکیزہ اور صاف ستھری تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں کسی کو شریک ٹھہرانے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، اسلام سے پہلے بھی جتنے آسمانی مذاہب تھے ان مذاہب کی تعلیمات بھی یہی تھیں اور تمام نبیوں اور رسولوں نے اپنی اپنی قوم کو توحید ہی کا سبق دیا اور اسی کلمہ کو دہراتے رہے یا قوم اعبدو الله والا تشركوا به شيئا۔ عقل انسانی بھی اس کی گواہی دے گی کہ اس خالق و مالک کے ساتھ کسی کو شریک کرنا خلاف عقل ہے۔ آسمانی کتابوں میں بھی توحید ہی کی اصلاً تعلیم دی گئی ہے، یہاں تک وید جو ہندوؤں کی مذہبی کتاب ہے اس میں بھی توحید کی تعلیمات بھری پڑی ہیں۔

لہذا جب سابقہ مذاہب کی تعلیمات کی بنیاد اور اصل توحید ہے اور اس کو بھی بتا دیا گیا ہے کہ اسلام آخری مذہب ہوگا اور محمد ﷺ آخری نبی ہوں گے، قرآن آخری (الہامی) کتاب ہوگی اور اسلام کے آنے کے بعد تمام مذاہب منسوخ ہو جائیں گے اور سب کو آخری نبی کی شریعت کی پیروی کرنی ہی ہوگی اور یہ تمام اشارات ان کی کتابوں میں موجود ہیں تو پھر اگر معبودان باطل پر تنقید کی جائے اور اس کے خلاف دلائل اور شواہد پیش کئے جائیں تو کون سی حرج کی بات ہوگی۔ لہذا میری نظر میں معبودان باطل پر تنقید کرنا، شرک کی مذمت بیان کرنا یہ عین دلیل ایمان ہے البتہ مذہبی مذاکرہ کے موقع پر اثبات توحید پر جب گفتگو ہوگی تو اس موقع پر زبان مہذب اور شائستہ زبان استعمال کرنا مذہبی مذاکرہ کرنے والے کی عین ذمہ داری ہوگی۔ شرک سے براءت شرک کی مذمت مکی زندگی میں کی گئی جو دل کی زندگی کہی جاتی ہے، آپ غور کر سکتے ہیں مکہ میں اسلام یعنی آخری مذہب کی تشکیل ہو رہی ہے، لیکن مکہ جیسے مشکل اور ناگفتہ بہ حالات میں آنحضرت ﷺ کفر و شرک کی شفاعت بیان کر رہے ہیں معبودان باطل پر برملا نقد کر رہے تو حید کا درس دے رہے ہیں اور ذرا برابر یہ احساس نہیں کر رہے ہیں کہ ابھی ابتدائی دور ہے تھوڑا بہت مشرکین سے اس معاملہ پر سمجھوتہ کر لیا جائے۔ بلکہ ہر طرح کی پیشکش کو آپ ﷺ ٹھکرا کر توحید کے نغمے کو مخالفت کے باوجود لوگوں کو سناتے رہے اور ان آیات کی تلاوت کرتے رہے۔ قل يا ايها الكافرون لا اعبد ما تعبدون اس مسئلے کی مزید وضاحت کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سورہ کافرون کے ضمن میں صاحب تفہیم القرآن نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ بیان کر دیا جائے۔

''مکہ مکرمہ میں ایک ایسا دور گزرا ہے جب آنحضرت ﷺ کی دعوت کے خلاف قریش کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا، لیکن قریش کے سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضورؐ کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جا سکے گا، اس لئے وقتاً فوقتاً وہ آپؐ کے پاس مصالحت کی تجویز لے کر آئے تاکہ آپؐ ان میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع (لڑائی) ختم ہو جائے جو آپؐ کے درمیان اور ان کے درمیان شروع ہو چکی تھی۔ اس طرح کے کئی واقعات احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ جس میں سے ایک روایت عبداللہ بن عباسؓ کی ہے کہ قریش کے لوگوں نے آنحضرتؐ سے کہا کہ ہم آپ کو اتنا مال دے دیتے ہیں کہ آپؐ مکہ کے سب سے امیر شخص بن جائیں گے، آپؐ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کر دیتے ہیں ہم آپ کے پیچھے چلنے

کے لئے تیار ہیں، بس آپ ہماری بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے رک جائیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔ حضورؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا ایک سال آپؐ ہمارے معبودوں لات اور عزی کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپؐ کے معبود کی عبادت کریں۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔ اس پر وحی نازل ہوئی قل یا ایھا الکافرون الخ اور قل افغیر اللہ تامرونی اعبد ایھا الجاھلون۔

یہاں اس بات کی مزید وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے اس جملہ کا کہ اچھا ٹھہرو میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپؐ کسی درجہ میں بھی اس تجویز کو قابل قبول کیا معنی، قابلِ غور بھی سمجھتے تھے، اور آپؐ نے معاذ اللہ کفار کو یہ جواب اس امید پر دیا تھا کہ شاید اللہ کی طرف سے اس کی منظوری آجائے۔ بلکہ در اصل یہ بات بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی ماتحت افسر کے سامنے کوئی بے جا مطالبہ پیش کیا جائے اور وہ جانتا ہو کہ اس کی حکومت کے لئے یہ مطالبہ قابل قبول نہیں ہے، مگر وہ خود صاف انکار کر دینے کے بجائے مطالبہ کرنے والوں سے کہے کہ میں آپ کی درخواست اوپر بھیج دیتا ہوں، جو کچھ وہاں سے جواب آئے گا آپ کو بتادوں گا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ ماتحت افسر اگر خود ہی انکار کر دے تو لوگوں کا اصرار جاری رہتا ہے لیکن اگر وہ بتائے کہ اوپر سے حکومت کا جواب ہی تمہارے مطالبہ کے خلاف آیا ہے تو لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔

اس سورت کے نزول کے سلسلہ میں اور بھی متعدد روایات ہیں جو احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفار قریش نے حضورؐ کے سامنے اس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دوٹوک جواب دے دیا جائے تا کہ اس امید کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ دین کے معاملے میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر ان سے مصالحت کر لیں گے۔

اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مذہبی رواداری کی تلقین کے لئے نازل نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ اس لئے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین اور ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی براءت، بیزاریء اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، ان کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداء قریش کے کفار کو مخاطب کر کے ان کی تجاویز مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی، لیکن یہ انہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اسے قرآن میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لئے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دین کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے ان کو اسی سے قول اور عمل میں براءت کا اظہار کرنا چاہیے اور بلا رعایت کہہ دینا چاہیے کہ دین کے معاملہ میں وہ کافروں سے کسی قسم کی مداہنت یا مصالحت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے یہ سورہ اس وقت بھی پڑھی جاتی رہی جب وہ لوگ مر کھپ گئے تھے جن کی باتوں کے جواب میں اسے نازل فرمایا گیا تھا، اور وہ لوگ بھی مسلمان ہونے کے بعد اسے پڑھتے رہے جو اس کے نزول کے زمانے میں کافر و مشرک تھے، اور ان کے گزر جانے کے صدیوں بعد آج بھی مسلمان اس کو پڑھتے ہیں کیوں کہ کفر اور کافری سے بیزاری ولاتعلقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔ (ملخص از تفہیم القرآن جلد ۶ صفحہ ۵۰۲۔۵۰۳)

لہذا ان تفصیلات کی روشنی میں مذہبی مذاکرہ کے دوران مذاہب باطلہ پر تنقید کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے مکہ کے حالات اور مشرکین کے جور وستم کے پس منظر میں اس سورہ کا نزول ہی ہمارے لئے مرجع اور مصدر کی حیثیت رکھتا ہے البتہ گفتگو کرنے کا طریقہ مہذب اور شائستہ ہو مثبت انداز میں اپنی بات کہی جائے حکمت اور موعظہ حسنہ کی رعایت کی جائے جادلھم بالتی ھی احسن کی نصیحت پر کان دھر کے گفتگو کی جائے ان کی کتابوں سے بھی توحید کے دلائل ڈھونڈ کر ان پر حقیقت کو آشکارا کیا جائے۔ خود

حضرت عیسیٰؑ نے اپنی ذات سے الوہیت کی جو نفی کی ہے اور جس انداز سے کی ہے، قرآن کی آیت کی روشنی میں عیسائیوں کو سمجھا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مشترک سماجی مسائل اور اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات:

مشترک سماجی مسائل مثلاً غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی پر مسلمانوں کا مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات عین اسلامی عمل ہوگا ایسے مواقع پر سارے مذاہب کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر جدوجہد کرنی چاہیے تاکہ ظلم کا خاتمہ ہو اور اہل حق کو ان کا حق ملے حلف الفضول کا واقعہ اس سلسلے میں ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے کہ کس طرح آپؐ نے بعثت سے پانچ سال قبل اس معاہدہ میں حصہ لیا اور فرمایا کہ جب بھی اس طرح کا معاہدہ ہوگا میں اس میں پیش پیش رہوں گا۔ اس معاہدہ میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہم ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کریں گے۔ آنحضرت ﷺ نے اعلانِ بنوت کے بعد فرمایا تھا:

''آج اسلام میں بھی اگر کوئی مظلوم یا آل حلف الفضول کہہ کر پکارے تو میں مدد دینے کو حاضر ہوں''۔

اس واقعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آپؐ نبوت پر فائز ہونے سے پہلے ہی سے انسانوں سے محبت اور ان کی خدمت کرتے تھے اور اس حوالے سے آپ سماج میں معروف و مشہور تھے۔ بارِ نبوت کو اٹھانے میں اس صلاحیت، خدمت اور خصوصیت نے آپؐ کو بڑی مدد پہنچائی۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ قدرت نے کارِ نبوت کو انجام دینے کے لئے آپؐ کا انتخاب کرنے سے پہلے آپؐ پر آسمانی وحی نازل ہوئی اور جب ہانپتے کانپتے غارِ حرا سے اپنی زوجہ محترمہ خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے چادر اڑھاؤ۔ مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو انھوں نے کہا "کلا واللہ لا یخزیك اللہ ابدا انك لتصل الرحم وتحمل الكل وتكسب المعدوم و تقرى الضيف وتعين على نوائب الحق۔ (صحیح البخاری) ہرگز نہیں اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا کیوں کہ آپ رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں۔ لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں ناداروں اور محتاجوں کی مدد کرتے ہیں مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت کے دنوں میں متاثرہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

اس روایت سے اس مسئلہ کی مزید تائید ہوتی ہے کہ مظلوم انسانوں کی خدمت کے لئے سماج اور معاشرہ کے ہر فرد کو چاہے اس کا دھرم اور مذہب کچھ ہو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو متحدہ کوشش کرنی چاہے اور اس کے لئے باہم صلاح و مشورہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ الخلق عیال اللہ کا لفظ اس کے لئے حدیث میں استعمال ہوا ہے۔

اسلام میں اکرام انسانیت کے پہلو پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسلام اپنے ماننے والے کو خاص طور پر یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر فرد اور ہر گروہ کو خواہ وہ کسی طبقے، کسی علاقے، کسی رنگ اور کسی نسل اور کسی بھی ذات و برادری سے تعلق رکھتا ہو، محترم سمجھنا اور عزت دینا اور انسانی بنیاد پر ان کی خدمت کرنا چاہیے۔

اس لئے ان ایشوز پر جن کا سوال نمبر ۶ میں ذکر کیا گیا ہے۔ مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنے میں از روئے شرع کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ایسے موقع پر مسلمانوں کو آگے بڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

جمہوری ممالک میں اہل سیاست اور مذہبی شخصیات سے سیاسی گفت شنید:

اس میں شک نہیں کہ عہد حاضر میں جمہوری ممالک کے اندر سیاست میں حصہ داری کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ لہٰذا اگر اس کے لئے کبھی مذہب کی نمائندہ شخصیات یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے ساتھ گفت و شنید کی ضرورت پیش آئے تو مسلمانوں کو ان سیاسی موضوعات اور ملکی قانون اور آئین پر ضرور مذہبی مذاکرہ کرنا چاہیے اگر چہ کہ ان سیاسی جماعت کے نصب العین میں اسلام مخالف کچھ باتیں بھی موجود ہوں۔ تب بھی اس کی گنجائش دی جائے گی۔ بلکہ میری نظر میں غیر مسلم ممالک میں سیکولر حکومتوں

کی تشکیل میں مسلمان نہ صرف حصہ لے سکتے ہیں بلکہ انھیں پوری بیدار مغزی اور فہم وفراست کے ساتھ اس میں بھرپور حصہ لینا چاہیے تاکہ اپنے دینی وملی مصالح کا تحفظ کرسکیں، حکومت دور حاضر میں زندگی کے تمام شعبوں پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتی ہے، حکومت کی تشکیل سے کنارہ کش ہوکر مسلمان اپنے دینی وملی وجود کو قائم رکھنے اور جائز دنیاوی مصالح کی حفاظت میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

اس سلسلے میں بہار کا موجود صوبائی الیکشن اور مسلمانوں کی دانشمندی کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے صحیح سیاسی فیصلہ نے کس طرح باطل طاقتوں کے قدم کو روکا اور جمہوریت کی روح کو دفن ہونے سے بچالیا۔

جہاں تک سوال یہ ہے کہ ان تنظیموں اور جماعتوں کے نصب العین میں اسلام مخالف باتیں بھی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے موقع پر اھون البلیتین کے اصول پر عمل کرنا مسلمانوں کی مجبوری بن جاتی ہے۔ شریعت کا اصول ہے کہ جہاں دو برائیوں میں سے کسی ایک برائی کو اختیار کرنا ناگزیر ہوجائے وہاں مسلمانوں پر لازم ہے کہ دونوں میں جو ہلکی ہو اس کو اختیار کرے۔ لہذا اس بنیاد پر مذاکرہ نہ کرنا کہ جمہوری حکومت بھی اسلامی حکومت سے مطابقت نہیں رکھتا اور جمہوریت کا مفہوم شریعت سے متصادم ہے۔ یہ نظریہ اور سوچ بہتر نہیں ہے کیوں کہ اگر جمہوری حکومت کی مجبوری ہی کے ساتھ سہی اگر تائید نہ کی گئی تو خطرہ ہوسکتا ہے کہ کہیں پورا ملک ہندو راشٹر اور عیسائی قانون والا آمری ملک نہ بن جائے۔ اس لئے میری نظر میں سیاسی مذاکرات میں شرکت ہونی چاہیے، واللہ اعلم بالصواب۔

مذہبی مذاکرات کے دوران غیر مسلم خواتین سے گفتگو:

اسلام میں پردہ کا ایک مکمل نظام اور سسٹم ہے دنیا کے کسی بھی مذہب میں پردہ کا اتنا منظّم قانون نہیں ہے۔ اسلام کا قانونِ حجاب فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہے۔ اور غیروں کو بھی اپیل کرتا ہے کہ اسلام کے اس قانون حجاب کو اختیار کرلو دنیا کی آدھی سے زیادہ برائی کا خاتمہ ہوجائے گا۔

چونکہ یہ تفصیل کا موقع نہیں ہے اس لئے اسلام کے نظامِ حجاب کا یہاں تذکرہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

بس صورت مسئلہ کا مختصر جواب یہ ہے کہ اگر مذہبی مذاکرات کے موقع پر اسٹیج پر فریق مخالف کی طرف سے خواتین بھی ہوں تو مسلمانوں کو اپنی نگاہوں کی حفاظت کرتے ہوئے ضرورت پڑنے پر ان سے گفتگو اور بحث کی اجازت ہوگی اور اگر مسلمانوں کی طرف سے بعض مخصوص مسائل پر بحث کرنے کے لئے مرد حضرات نہ ہوں یا اس موضوع پر کوئی مسلمان عورت ہی صحیح نمائندگی کرسکتی ہے تو اس مسلمان عورت کو چاہیے کہ مکمل اسلامی پردہ کے ساتھ مجلس میں شریک ہو اور ضرورت پڑنے پر مذاکرہ میں حصہ لے، اپنی آواز میں لچک نہیں بلکہ گرج اور کڑک والی کیفیت رکھے، یہی قرآنی تعلیم بھی ہے۔

چونکہ مذہبی مذاکرہ میں ہر شخص اپنے مذہب کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا تذکرہ کرے گا، اس لئے اس موقع پر مسلمانوں کو نہیں چوکنا نہیں چاہیے کہ خود ان کے مذاہب کا حوالہ دے کر ان کی خواتین کو بھی پردہ کا مکلّف بنائیں۔ مگر حکمت اور دانشمندی کے ساتھ۔ غیر مسلموں کو بھی بتایا جائے کہ آپ کے مذہبی کتابوں میں سیتا جی کا لباس کیا تھا۔ انکا پردہ کیسا تھا۔ عیسائیوں کو بتایا جائے مریمؑ بتول کس طرح پردہ میں رہتی تھیں۔

اس موقع پر محض اس بنیاد پر مذاکرہ میں شرکت نہ کرنا کہ وہاں خواتین بھی ہوں گی بہتر اور درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں اسلام کی دعوت اور پیغام دوسروں تک نہ پہنچانا اس سے زیادہ سنگین جرم ہوگا اور ممکن ہے یہ مذاکرہ دوسروں کے اسلام کا سبب بن جائے یا کم سے کم آپسی منافرت کم ہوجائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

❑ انکار حدیث

احمد امین کی ردکردہ بعض احادیث

تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

ڈاکٹر احمد امین نے تنقید حدیث کے جو اصول وضع کیے تھے، ان کی حقیقت گذر چکی ہے۔ ان اصولوں کے غلط انطباق اور عقل کے بے محابا استعمال کی وجہ سے انھوں نے بہت سے مقامات پر ٹھوکر کھائی ہے، اور بعض ایسی احادیث کو بھی، جو عقل ونقل ہر اعتبار سے صحیح ہیں، انھوں نے رد کر دیا ہے۔ کچھ ایسی ہی احادیث کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی حدیث: "لاتبقی علی ظهر الأرض بعد مائة سنة نفس منفوسة "سو سال کے بعد زمین پر کوئی جاندار زندہ نہیں رہے گا۔ (بخاری)

احمد امین صاحب نے اس حدیث کا مفہوم یہ سمجھا کہ دنیا سو سال بعد ختم ہو جائے گی۔ اور اس وجہ سے اسے موضوع قرار دیا، کیونکہ یہ بات تاریخی حقائق اور حس ومشاہدہ کے خلاف ہے۔

حالانکہ یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ بخاری ومسلم سمیت کئی کتابوں میں موجود ہے۔ احمد امین نے بخاری کے کتاب العلم سے نقل کیا ہے یہاں تو یہ مختصر ہے مگر بخاری میں ہی دوسری جگہ مکمل وطویل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات اپنی زندگی کے آخری ایام میں ارشاد فرمائی تھی اور اس میں یہ الفاظ ہیں "من هو اليوم على ظهر الأرض "اور مطلب یہ تھا کہ اس وقت جو لوگ موجود ہیں، سو سال کے بعد ان میں سے کوئی باقی نہ رہے گا۔ جو غلط فہمی احمد امین کو ہوئی، وہی صحابہ کرام کو بھی ہوئی تھی، مگر حضرت ابن عمرؓ نے اور طبرانی کی روایت کے مطابق حضرت علی نے بھی ان کی اس غلط فہمی کو دور کیا تھا۔

اب بتائیے کہ اس میں ایسی کون سی بات ہے جو خلاف عقل ہو، بلکہ یہ تو رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ثابت ہوئی، چنانچہ جیسے آپ نے فرمایا تھا ویسا ہی ہوا، کہ اس وقت موجود لوگوں میں کوئی بھی سو سال بعد زندہ نہیں رہا، سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہ ہیں جن کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ۱۰ یا ۱۱ھ میں کہی تھی تو اس طرح سو سال کے اندر اندر تمام صحابہ کرام کی وفات ہو گئی۔

تمام ہی شراح حدیث ابن حجر عسقلانی، نووی، ابن بطال وغیرہ نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے کہ اس وقت جب یہ بات ارشاد فرمائی جا رہی تھی موجود لوگوں میں سے سو سال کے بعد کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا، کسی نے بھی اس سے یہ مراد نہیں لیا کہ سو سال بعد دنیا ختم ہو جائے گی۔

پھر امام مسلم نے اس مفہوم کے مختلف الفاظ نقل کیے ہیں جن میں سے بعض اس مفہوم پر صراحۃً دلالت کر رہے ہیں: ''کوئی جاندار آج ایسا موجود نہیں کہ اس پر سو سال گزریں اور وہ اس وقت زندہ ہو''۔

آپ نے دیکھا کہ جو حدیث حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ تھی، وہ احمد امین کی تنقید جدید کے پیمانے سے موضوع قرار پائی۔

عجیب بات یہ ہے کہ محدث ابن قتیبہ نے ''تاویل مختلف الحدیث'' میں جہاں نظامیہ اور دیگر معتزلہ کے محدثین پر لگائے گئے الزامات کا جواب دیا ہے، وہیں اس حدیث کو بھی ذکر کیا ہے اور اس پر جو شکوک وشبہات تھے ان کا تعاقب کیا ہے۔

مگر حیرت ہے کہ احمد امین نے ان سب باتوں سے صرف نظر کیا، حالانکہ اس نے اپنی کتاب کے آخر میں مراجع کی جو فہرست دی ہے اس میں فتح امیں لباری، قسطلانی اور شرح نووی کا نام بھی درج ہے، اور ان حضرات نے جو مفہوم مراد لیا ہے وہ گزر چکا۔ اب یا تو اس نے ان شروحات کو دیکھا ہی نہیں اور ایسے ہی فہرست میں ان کا نام درج کر دیا۔ یا پھر انھیں دیکھنے کے باوجود عمداً یہ غلطی کی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص قدما میں سے معتزلہ اور نظامیہ میں اور متاخرین میں سے مستشرقین کے اعتراضات پر اطمینان ومسرت کا مظاہرہ کرتا ہو اس سے یہ بات بعید نہیں۔

دوسری حدیث: ''جو شخص صبح صبح سات عجوہ کھجوریں کھالے تو اس دن رات تک اس پر زہر اور جادو کا اثر نہ ہوگا''۔

احمد امین نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔

اسے بخاری نے کتاب الطب میں اور مسلم واحمد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

اس حدیث کی تشریح میں علماء کی مختلف آراء ہیں:

اکثر علماء کہتے ہیں کہ یہ مدینہ کی عجوہ کھجور کے ساتھ خاص ہے اور مسلم کی ایک روایت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ ''عالیہ (مدینے) کی عجوہ باعث شفا ہے''۔ علماء فرماتے ہیں کہ ایسا بالکل ہوسکتا ہے کہ ایک شہر کی مٹی میں وہ خاصیت ہو جو دوسرے شہر میں نہ ہو۔ جیسے کسی شہر کی ایک دوا میں جو تاثیر ہوتی ہے دوسرے شہر کی اسی دوا میں وہ مفقود ہوتی ہے، نیز اس میں آپ ﷺ کے دست مبارک کی برکت کا بھی دخل ہوسکتا ہے کیونکہ عجوہ آپ نے ہی اپنے دست مبارک سے لگائی تھی۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ بات ہر عجوہ کے بارے میں ہے، اس میں مدینے کی تخصیص نہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زہر فرط برودت کی وجہ سے مہلک ہوتا ہے اور روزانہ عجوہ کھانے سے حرارت پختہ ہوجائے گی، حرارت غریزی اس کی مزید معاون ہوگی۔ یہ دونوں حرارتیں مل کر زہر کی برودت کا مقابلہ کریں گی۔

اکثر علماء پہلی رائے کے قائل ہیں۔ ابن قیم فرماتے ہیں:

''عالیہ کی کھجور بہت عمدہ ہوتی ہے، یہ ملیّن مزے دار اور شیریں ہوتی ہے، کھجور دوا بھی ہے، غذا بھی اور میوہ بھی، اس حدیث کے اصلی مخاطب اہل مدینہ کے لوگ ہیں .....اس میں شک نہیں کہ بلاد وامصار کا ادویہ سے گہرا تعلق ہوتا ہے.....نباتات کی بعض قسمیں ایسی ہیں جو بعض علاقوں میں غذا سمجھی جاتی ہیں اور بعض جگہ انھیں مہلک زہر تصور کیا جاتا ہے.....نہار منہ کھجور کھانے سے پیٹ کے کیڑے مرجاتے ہیں، کھجوروں کی یہ تعداد جو حدیث میں مذکور ہے، (سات) خصوصا جبکہ وہ کھجوریں مدینہ کی ہوں، زہر اور جادو کے اثر کو دور کردیتی ہے، یہ ایسی بات ہے کہ اگر بقراط اور جالینوس بتاتا تو لوگ اسے مان لیتے جبکہ ان کی بات ظن وتخمین پر مبنی ہوتی ہے''۔

نیز ہم دیکھتے ہیں کہ ایک حکیم کسی دوا کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس میں زہر کا علاج ہے تو ہم اسے فوراً تسلیم کر لیتے ہیں، تو اگر عجوہ میں اس کا پیشگی علاج ہو تو اس میں تعجب کیا؟

کسی حدیث کو جھٹلانا اس وقت درست ہوسکتا ہے جبکہ وہ سندی اعتبار سے کمزور ہو یا عقل وطب سے اس کا بطلان یقینی طور پر ثابت

ہو چکا ہو۔اس اعتبار سے زیر بحث حدیث کو دیکھئے تو یہ سندی اعتبار سے بالکل صحیح وثابت ہے۔اور اس کا متن بھی بالکل صحیح ہے، اس لیے کہ ابھی تک عقلی وطبی اعتبار سے اس کا غلط ہونا ثابت نہیں ہوسکا ہے، بلکہ اس کے برخلاف جدید طب نے اس کی افادیت کو تسلیم کیا ہے، اور خود بہت سے لوگوں نے اس کا تجربہ بھی کیا ہے۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ طب ابھی بھی آخری حد تک نہیں پہنچی ہے اس لیے کوئی یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ اس نے عجوہ کی تمام خصوصیات کا پتہ لگالیا ہے، بلکہ مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے طب ترقی کرتا جائے گا وہ اس کی افادیت وحقانیت کو مزید ثابت کرتا جائے گا۔

اور رہی بات کہ یہ جادو کے اثر سے بچاتی ہے تو اس کے بارے میں یہ سمجھ لیجئے کہ جادو ایک نفسیاتی بیماری ہے، اور طب نے ثابت کیا ہے کہ نفسیاتی بیماری کا نفسیاتی طریقے سے علاج کیا جائے تو بڑا مفید ہوتا ہے، ایک مسحور شخص جب عجوہ کی ان تمام خصوصیات کو سنے گا جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا تو نفسیاتی طور پر اس پر اس کا بڑا اچھا اثر پڑے گا۔

بہر حال اس سے ثابت ہوا کہ جب تک کسی حدیث کی عقلی توجیہ ممکن ہو اس کی تکذیب میں جلد بازی کرنا دانشمندی نہیں۔

تیسری حدیث: ''ککرمتا ترنجبین میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے باعث شفا ہے''

یہ روایت ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں ہے۔

احمد امین نے اسے بھی موضوع قرار دیا ہے۔موصوف لکھتے ہیں:

''کیا محدثین نے اس حدیث کی تحقیق کے لیے ککرمتا کو آزما کر دیکھا ہے کہ اس میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے..... ہاں روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے اس کا تجربہ کیا اور اس کا پانی اپنی باندی کی آنکھ میں ڈالا جس کی نظر کمزور تھی تو وہ ٹھیک ہوگئی.....مگر یہ انفرادی تجربہ ہے، اور نقد حدیث کے لیے کافی نہیں، بلکہ کئی مرتبہ تجربہ کرنا چاہئے تھا.....''۔

یہاں دو باتیں عرض ہیں:

۱۔ اولاً تو یہ روایت صحیح ہے، بخاری ومسلم وغیرہ میں بھی ہے۔

۲۔ حضرت ابو ہریرہ نے اور آپ کے بعد بہت سے لوگوں نے اس کا تجربہ کیا اور اسے درست پایا۔نووی کہتے ہیں کہ ان کے زمانے میں ایک عالم نے اس کا تجربہ کیا اور اس کی بینائی واپس آئی۔اسی طرح ابن قیم نے لکھا ہے کہ بعض اطباء جیسے ابو سہل مسیحی اور ابن سینا وغیرہ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ محدثین وعلماء نے اس کا تجربہ کیا یا نہیں؟ پھر موصوف کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ علماء نے اس کا تجربہ نہیں کیا، ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا خود انھوں نے اس کا تجربہ کیا تھا جو اسے غلط پایا؟ پھر اگر مان لو کہ انھوں نے تجربہ کیا اور غلط پایا تو سوال یہ ہے کہ کیا ان کے پاس اس قسم کا ککرمتا تھا جو عہد رسالت میں پایا جاتا تھا؟

جب اس کی سند بھی صحیح ہے اور علماء نے بارہا اس کا تجربہ بھی کر لیا ہے، پھر بھی آخر اسے جھٹلایا جائے؟ اس کی کوئی وجہ؟

چوتھی حدیث: حضرت ابن عمر کا حضرت ابو ہریرہ پر نقد کرنا:

روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا: ''جس نے کتا پالا تو ہر روز اس کے اجر میں سے دو قیراط کم ہوتے رہیں گے سوائے اس کے کہ شکار یا مویشیوں کی حفاظت کے لیے پالا ہو''۔اسے سن کر کسی نے حضرت ابن عمر سے کہا کہ حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں تو "أو كلب زرع" بھی ہے، یعنی کھیتی کی

حفاظت کے لیے بھی کتا پالنے کی اجازت دی گئی ہے، تو حضرت ابن عمر نے فرمایا: ابو ہریرہ کی کھیتی تھی''۔

احمد امین نے حضرت ابن عمر کے آخری الفاظ کو مذمت پر محمول کیا ہے اور یہ تاثر دینا چاہا ہے کہ نعوذ باللہ چونکہ حضرت ابو ہریرہ کھیتی کرتے تھے اس لیے انھوں نے یہ لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا۔

کتنا بڑا اور سنگین بہتان ہے یہ!!

اس سلسلے میں دو باتیں عرض ہیں:

۱۔ "أو كلب زرع" کے الفاظ بیان کرنے میں حضرت ابو ہریرہؓ تنہا نہیں ہیں، بلکہ دیگر بہت سے صحابہ کرام سے بھی یہ الفاظ منقول ہیں، چنانچہ بخاری و مسلم میں کئی احادیث مروی ہیں جن میں صراحۃً کتا پالنے کی اجازت منقول ہے، نیز مسلم میں خود حضرت ابن عمر سے بھی یہ اضافہ نقل کیا گیا ہے، ہوسکتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ ان الفاظ کو بھول گئے ہوں، پھر حضرت ابو ہریرہ سے سن کر انھیں روایت کرنے لگے ہوں، یا پہلے وہ ان الفاظ کے بغیر روایت کرتے رہے ہوں پھر جب انھوں نے یہ الفاظ سنے تو رسول اللہ ﷺ سے تحقیق کر لی ہو اور پھر انھیں بھی روایت کرنا شروع کر دیا ہو۔

بہر حال حضرت ابو ہریرہ اس اضافے میں منفرد نہیں ہیں، اور اگر منفرد بھی ہوتے، تب بھی ان کا یہ اضافہ قبول کیا جاتا۔

۲۔ پھر اس سے کسی بھی طرح حضرت ابو ہریرہ کی مذمت کا پہلو نہیں نکلتا ہے؛ بلکہ شارحین حدیث نے اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ تو دراصل حضرت ابو ہریرہ کی مدح ہے، نووی کے الفاظ میں:

''ابن عمر کہنا چاہ رہے ہیں چونکہ حضرت ابو ہریرہ کھیتی والے تھے اس لیے انھوں نے ان الفاظ کو خاص طور سے یاد رکھا (اور حضرت ابن عمر بھول گئے) اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ جو شخص کسی کام میں مبتلا ہوتا ہے، وہ اس کے احکام دوسروں سے کہیں زیادہ یاد رکھتا ہے''۔

یہ ہے اس کا حقیقی مفہوم۔ نہ جانے احمد امین کیوں اس میں مذمت کا پہلو نکالنے پر مصر ہیں، پھر حضرت ابن عمرؓ حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں ایسی رائے کیسے دے سکتے تھے جبکہ وہ حضرت ابو ہریرہؓ کا خود بہت زیادہ احترام کرتے تھے، اور ان کا قول ہے:

''حضرت ابو ہریرہؓ حدیث کے سب سے بڑے حافظ ہیں''۔

یہ ہے احمد امین صاحب کے اصول تنقید کی حقیقت، جن کی وجہ سے انھوں نے کئی جگہ ٹھوکر کھائی ہے، ہم نے جو تفصیل بیان کی، اس سے ثابت ہوا کہ ہمارے محدثین کا طریقہ ہی درست اور معقول طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ جب کوئی حدیث صحیح سند سے مروی ہو اور اس کے متن میں بھی کوئی واقعی قابل اعتراض چیز نہ ہو، تو ایسی روایت کی تکذیب درست نہیں؛ اس لیے کہ اس سے یا قول رسول کا انکار لازم آتا ہے- اور کسی مسلمان سے ایسی امید نہیں کی جا سکتی- یا ان صحابہ و تابعین کی تکذیب لازم آتی ہے جو تاریخ انسانی کے سب سے سچے اور نیک انسان تھے۔ اگر احمد امین کہیں کہ ہم ان ثقہ راویوں کی تکذیب نہیں کرتے؛ بلکہ ہمارا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ان سے وہم و خطا کا صدور ممکن ہے، تو ہم کہیں گے کہ یہ ایک کمزور احتمال ہے، اور ان کا سچا ہونا اور وہم کا صادر نہ ہونا ظن راجح سے ثابت ہے، اس لیے یہ کمزور احتمال ظن راجح پر غالب نہیں آ سکتا۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

اجتماعی نشو ونما اور بچے کے دوسروں کے ساتھ تعلقات:

یہاں ہم تین پہلوؤں پر گفتگو کریں گے:

۱۔ بھائیوں اور بہنوں سے تعلقات

۲۔ اپنے دوستوں کے ساتھ تعلقات

۳۔ دیگر اعزہ اور اقربا سے تعلقات

۱۔ بچے کے بھائیوں اور بہنوں سے تعلقات: یہ عام بات ہے کہ اگر کسی گھر میں ایک سے زائد بچے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ بچے ہیں یا بچیاں تو وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور اختلاف کرتے ہیں، آپ دیکھیں گے کہ وہ آپس میں لڑنے کے لئے نئے نئے بہانے تلاش لیتے ہیں، یہ دیکھ کر تعجب ہوگا بلکہ کبھی کبھی آپ پریشان ہوں گے کہ ان میں آپس میں جھگڑنے اور اختلاف کرنے کی کس قدر قدرت ہے کہ وہ اس کے لیے نئی نئی شکلیں پیدا کر لیتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیق واختراع کی یہ قدرت واہلیت اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ بچے ان جھگڑوں اور آپسی نوک جھونک سے لطف اندوز ہوتے ہیں، البتہ اس پہلو کی وضاحت نہیں ہو پاتی کہ کیا یہ چیز ان کے لیے مفید بھی ہے۔

بچے آپسی جھگڑوں اور اختلاف کے سبب ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے امکانات اور ضعف وقوت کے پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرتے ہیں، اس طرح وہ ہر ایک کی مستقل اور منفرد شخصیت کا تعین کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عمر و امکانات میں جس قدر تقارب ہوتا ہے آپسی جھگڑوں میں اسی قدر شدت ہوتی ہے، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک دوسروں کے بالمقابل اپنی مستقل شخصیت اور انفرادیت کو حاصل کرنے اور ثابت کرنے پر زور دیتا ہے، اور ہر ایک اپنے نفس اپنے اسلوب وکیفیت اپنی پلاننگ اور اپنے دفاع نیز دوسروں پر وار کرنے اور پھر اختلافات کو حل کرنے سے واقف ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ بچے ان جھگڑوں کے ذریعہ فتح وغلبہ کے نشہ کا تجربہ کرتے ہیں، اسی طرح شکست ومغلوبیت کے احساسات کا بھی تجربہ کرتے ہیں، اسی لیے عام طور پر بچے یہ پسند کرتے ہیں کہ گھر میں ان کے ساتھ کوئی اور بچہ ہو جس پر وہ زور آزمائی کریں، اس کے ساتھ لڑائی جھگڑے کے ذریعہ وہ اپنی قوت واہلیت اور تدبیروں کا تجربہ کریں، بالمقابل اس کے کہ وہ گھر میں تنہا رہیں اور اکتاہٹ کا شکار رہیں۔

طبعی بات ہے کہ ان لڑائی جھگڑوں سے والدین کی زندگی بہت زیادہ پرسکون نہیں رہتی، اکثر والدین یہ شکوہ کرتے ہیں کہ اس سے ان کے اعصاب پر برا اثر پڑتا ہے، یہ بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے کہ آخر ہر وقت وہ کس طرح بچوں کے ان جھگڑوں میں مداخلت کریں، پھر اس سے بھی اہل خانہ پریشان ہوتے ہیں کہ وہ گھریلو زندگی میں جس سکون کی امید کرتے ہیں وہ انھیں غارت ہوتا نظر آتا ہے، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بچے ہمیشہ محبت وسلامتی اور سکون کے ساتھ آپس میں کھیلتے رہیں، والدین بچوں کے لڑائی جھگڑوں کو روکنے سے عاجز ہو جاتے ہیں، پھر گھر میں سکون وامن چند منٹ سے زیادہ

برقرار نہیں رہ پاتا، بعض مرتبہ والدین کو تربیت کے سلسلہ میں اپنی اہلیت پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے جس کے سبب ان میں سے بہت سے لوگوں کو بڑا دکھ اور رنج ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات بعض والدین یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ بچے والدین کو پریشان کرنے کی غرض سے آپس میں جھگڑے کرتے ہیں۔

اس مشکل میں مزید اضافہ تب ہوجاتا ہے جبکہ والدین بچوں کے درمیان مداخلت کرتے ہیں اور ایک بچے کے خلاف دوسرے کے حق میں موقف اختیار کرتے ہیں، لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ بچہ جس کے ساتھ والدین کھڑے تھے وہ پلٹ جاتا ہے اور پھر اپنے اسی بھائی یا بہن کے ساتھ ہوجاتا ہے جس کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا تھا، گویا محبت واخوت بچوں کے درمیان اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ اہل خانہ ہمہ وقت میدان میں رہیں اور ان کے درمیان مداخلت کرتے رہیں۔

آپسی تکرار اور جھگڑے میں بچوں کی عادتیں عام طور پر مختلف ہوتی ہیں، بعض بچے زیادہ تر اوقات میں بڑی گہری دوستی کے انداز میں پیش آتے ہیں، بعض مسلسل جھگڑتے ہیں، حتی کہ بالکل پرسکون وقت میں بھی بعض ہلکے پھلکے اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں جس سے والدین متوجہ ہوتے ہیں اور مصالحت کراتے ہیں، بچوں کے آپسی جھگڑے کا یہ مسئلہ اس وقت مزید پیچیدہ ہوجاتا ہے جب کسی کے دو سے زائد بچے ہوں اور ان میں سے بعض بعض کے خلاف متحدہ محاذ بنالیں۔

بچوں کے درمیان جب جھگڑا شروع ہو تو آپ کیا کریں!

اگر آپسی جھگڑے میں کسی بچے کو کوئی جسمانی تکلیف پہنچ جائے تو اہل خانہ کی طرف سے پہلا اقدام یہ ہونا چاہیے کہ وہ جسمانی طور پر ہی مداخلت کریں، اس طرح کے مسائل عام طور پر بچوں کے درمیان پیش آتے رہتے ہیں، مشاہدے میں یہ آتا ہے کہ بچیاں اکثر وبیشتر ہاتھ پیر کے استعمال کے بجائے چیخ پکار زیادہ مچاتی ہیں، لڑکوں اور لڑکیوں میں یہ فرق معاشرتی اثرات اور توقعات کے سبب ہوتا ہے، چنانچہ بچیوں سے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ''لڑکیاں ہاتھا پائی نہیں کرتی ہیں'' جبکہ بچوں سے کہا جاتا ہے ''مرد روتے نہیں ہیں اور آپ تو مرد ہیں'' لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ دونوں ہی جنس میں ہاتھا پائی کرنے اور زخم پہنچانے کی قدرت وصلاحیت ہوتی ہے۔

چنانچہ اگر کسی وقت آپ کو یہ احساس ہو کہ کوئی بچہ زخمی ہوجائے گا یا پھر گھر کی کسی چیز کو نقصان پہنچے گا تو آپ فورا بچوں کو روکیں اور ان سے کہیں کہ وہ باز آجائیں، یہ بھی ممکن ہے کہ آپ جسمانی طور پر مداخلت کرکے ان کو الگ کردیں، یہ یاد رکھیے کہ اگر آپ نے ان کو چھڑانے کی ابتدا مار پیٹ سے کی تو گویا آپ نے بھی وہی کام کیا جس سے آپ ان کو روکنا چاہتے تھے۔

جب صلح صفائی ہوجائے اور ماحول پرسکون ہوجائے تو پھر آپ کچھ وقت ان کے ساتھ گزاریے اور معلوم کیجئے کہ آخر اس معرکہ کی شروعات کیسے ہوئی تھی، یہ عام بات ہے کہ ایسے موقع پر آپ کو دو الگ الگ بلکہ متضاد کہانیاں سننے کو ملیں گے، دونوں فریق کچھ اس طرح عرض حال کریں گے گویا وہ بری ہوں اور ان پر دوسرے نے ظلم کیا ہو، آپ کے لیے یہ تعین کرنا دشوار ہوگا کہ دونوں میں سے کون سچا اور کون جھوٹا ہے، ایسے موقع پر سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ بچوں کو یہ احساس دلائیں کہ آپ ان کی پوری بپتا اور مکمل احوال سننے کے لئے تیار ہیں، صرف مداخلت اور یہ پتہ لگانے کے مقابلہ میں کہ کون ملامت کا مستحق ہے اور کون مجرم ہے یہ زیادہ ضروری ہے کہ آپ اپنے کو ان کی پوری کہانی سننے کے لئے پیش کردیں، اس صورت میں بچے آپ کو غیر جانبدار اور منصف خیال کریں گے اور یہ سمجھیں گے کہ آپ ان کو اپنی بات پوری آزادی کے ساتھ بغیر کسی سختی اور تشدد کے کہنے کا موقع دیتے ہیں۔

البتہ اگر ان میں مار پیٹ اور ہاتھا پائی نہیں ہوئی ہے تو آپ کو معاملہ حل کرنے اور مداخلت کرنے میں قطعا عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے، اس لیے کہ بچوں کو اس طرح کے اختلافات اور جھگڑوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ان کے ذریعہ بہت کچھ سیکھتے ہیں، اگر آپ ان کو مکمل طور سے اس چیز سے روکیں گے تو پھر وہ اس صلاحیت کو استعمال کرنے کا بدل تلاشیں گے، کیوں کہ یہ ان کی زندگی کا حصہ ہے، اس لیے بچوں کو اس کا موقع فراہم کیجئے، جب وہ اپنی بات رکھیں گے تو ان

کو یہ بھی پتہ چلے گا کہ وہ کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے، ان پر اپنی صلاحیتوں کا انکشاف ہوگا، اور ایک دوسرے کے احساسات سے وہ واقف ہوں گے، اس طریقے سے ان کے مسلسل نمو کے ساتھ ان میں پختگی آئے گی اور وہ ایڈجسٹ کرنا بھی سیکھیں گے، اگر آپ ان کے درمیان حدود قائم کر دیں گے اور ان کو ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے باز رکھیں گے تو گویا آپ انھیں بہت سے امور سے محروم کر دیں گے، پھر ان پر اپنی صلاحیتیں منکشف نہ ہوسکیں گی، وہ اپنے معاملات و اختلافات کو سلجھانا اور حل کرنا نہ سیکھ سکیں گے، وہ یہ بھی نہ سیکھ پائیں گے کہ اپنے درمیان سکون کا ماحول کیسے قائم رکھیں، اگر آپ ہمیشہ ان کے مواقف پر مسلط رہیں گے تو بچے یہ سمجھیں گے کہ ان کے آپسی تعلقات محض آپ کے تسلط سے قائم ہیں، یعنی وہ غیر طبعی اور محدود تعلقات ہیں، اگر یہ نفسیات پیدا ہوگئی تو آپ جیسے ہی اوٹ ہوں گے وہ ایک دوسرے سے لڑ پڑیں گے، یا یہ کہ ان میں دشمنی کی نفسیات بچپن کے مرحلہ میں پنپتی رہے گی، پھر آئندہ زندگی میں انھیں تصفیہ کے مواقع نہ ملنے کے سبب اپنے معاملات و اختلافات سلجھانے میں بڑی دشواری ہوگی، ان کے درمیان آپسی تعلقات بھی نہایت کمزور ہوں گے، وہ ایک دوسرے سے الگ رہنے کو زیادہ ترجیح دیں گے، چنانچہ جیسے ہی آپ ان کو گھر چھوڑنے کا موقع دیں گے وہ ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں گے۔

اس کے بالمقابل اگر بچپن میں بچوں کو لڑائی جھگڑے کے کچھ مواقع ملتے ہیں تو نوجوانی کے مرحلہ میں ان کو یہ فائدہ ملتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوتے ہیں، اور آپس میں ان کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے، ایک دوسرے کے بہت قریب ہوجاتے ہیں، ہر ایک اپنی حدود سے واقف ہوجاتا ہے، ہر ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کا احترام کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے بچہ بڑھتا رہتا ہے ویسے ویسے یہ جھگڑے کم ہوتے جاتے ہیں، اور وہ دوسروں سے پریشان ہونے یا پریشان کرنے کے احساس سے نجات پا جاتا ہے، اس کے برعکس بچہ دوسروں کے ساتھ دوستی کرنے لگتا ہے، ان میں گھلنے ملنے لگتا ہے، اب وہ اپنے اس لڑائی جھگڑے کے بالمقابل دوستانہ رویہ سے بہت فائدہ اٹھاتا ہے اور بہت کچھ سیکھتا ہے۔

بچوں کے آپسی جھگڑوں میں بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ ہر وقت ان کے ہر جھگڑے میں بالکل مداخلت نہ کریں، البتہ جب آپ دیکھیں کہ کسی بچہ کو جسمانی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے یا گھر میں کچھ توڑ پھوڑ ہونے کا خطرہ ہے یا کوئی بچہ کسی پر مکمل غلبہ حاصل کر رہا ہے اور کسی کو پورے طور پر سے یشان کرنے پر تلا ہوا ہے تو پھر آپ مداخلت کریں۔

آپ کو ہمیشہ یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ جھگڑے مکمل طور پر نقصان دہ نہیں ہوتے اور نہ ہی ان میں وہ برائی ہوتی ہے جو بڑوں کو محسوس ہوتی ہے، ہاں اگر معاملہ حد سے گزر جائے تو آپ کو مداخلت کا حق ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اس لیے بھی آپ کو یہ حق ہے کہ اپنے اعتبار سے آپ جب چاہیں تو گھر میں امن وسکون آپ کو حاصل رہے، لیکن بچوں کے سامنے آپ کو یہ واضح کر دینا چاہیے کہ آپ اس کے خلاف نہیں ہیں کہ بچے خود ہی اپنے اختلافات کو حل کر لیں، انھیں یہ سمجھانا چاہیے کہ آپ اس پریشان کن اور شور وشغب والے انداز کے خلاف ہیں جو وہ آپسی اختلافات کو حل کرنے کے لئے اپنا رہے ہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چند منٹ بعد وہ پھر جھگڑنے لگیں تو اس وقت آپ ان کو الگ الگ کر دیں اور ان میں سے ہر ایک کو الگ کمرے یا الگ الگ جگہ پر بھیج دیں، یہ علیحدگی اور تفریق کسی لمبی مدت کے لئے نہیں بلکہ فوری اور وقتی ہوگی، اور اس کا مقصد صرف بچوں کو یہ سمجھانا اور یہ احساس دلانا ہوگا کہ تنہا بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ سکون کے ساتھ رہ کر ایک ساتھ کھیلا جائے، اس علیحدگی کے بعد وہ سب تھوڑی ہی دیر میں پرسکون بھی ہوجائیں گے۔

اگر ان کے آپسی جھگڑے کی وجہ کوئی کھلونا یا کوئی اور چیز ہو تو آپ کو چاہیے کہ وہ چیز اس وقت آپ ان سے لے لیں، اور ان سے کہہ دیں کہ یہ چیز اب آپ لوگوں کو اسی وقت دی جائے گی جبکہ آپ کسی متفقہ فیصلے تک پہنچ جائیں اور مسئلہ کو سب مل کر حل کر لیں کہ بغیر جھگڑے کے آپ سب ایک ساتھ اس سے کھیلیں گے، جب وہ سب کسی نقطہ پر متفق ہوجائیں تو آپ کو مطلع کر سکتے ہیں، جب وہ آپ

سے اپنے متفقہ فیصلے کی پابندی کرنے کا وعدہ کرلیں تو آپ انھیں وہ کھلونا واپس کردیں، اور انھیں سکھائیں کہ کسی مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کچھ تنازلات اختیار کرکے اتفاق کیا جائے، تبھی کسی ایسے حل تک پہنچا جا سکتا ہے جس سے تمام فریق راضی ہوں، انھیں بتائیے کہ اس سے مستقبل میں تعلقات استوار رکھنے میں بڑی مدد ملے گی، اس طریقے سے وہ مناقشے اور ڈائیلاگ کا اسلوب بھی سیکھیں گے، غالب گمان یہ بھی ہے کہ جب وہ خود سے کسی فیصلے اور اتفاق پر پہنچیں گے تو اس فیصلے اور قانون کی وہ زیادہ پاسداری کریں گے بہ نسبت اس کے کہ ان پر آپ کوئی قانون نافذ کریں۔

کبھی کبھی یہ مشکل بڑھ جاتی ہے، اس طرح کہ جھگڑنے والے بچوں میں عمر کا فرق زیادہ ہوتا ہے، کیوں کہ عمر کے فرق وتفاوت کے ساتھ جسمانی، اعصابی اور ذہانت وفہم میں بھی فرق ہوتا ہے، ایسے موقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ بڑا بہرحال چھوٹے سے زیادہ طاقتور اور قادر ہوتا ہے، ساتھ ہی چھوٹا بھی بڑے کو پریشان کرنے اور غصہ دلانے کی قدرت رکھتا ہے اور اپنے چھوٹے ہونے کو ڈھال بناتا ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ جھگڑے کی صورت میں آپ بڑے کے بالمقابل اس کا ساتھ دیں گے، یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سب بچے حتی کہ ان میں سب سے چھوٹا بھی والدین کی شفقت وعنایت کو حاصل کرنے کے معاملہ میں خوب باخبر ہوتا ہے، خواہ وہ خطا پر ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ وہ آنسو بہاتا ہے اور افسوس کا اظہار کرتا ہے، ہلکی پھلکی چوٹ کو بڑی بنا کر پیش کرتا ہے اور گویا یہ تاثر دیتا ہے کہ اس کو فوری علاج کی ضرورت ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ چھوٹا بچہ بہانے باز اور بدتمیز ہے، بلکہ معاملہ دراصل یہ ہے کہ وہ اسی کو بہترین اسٹراٹیجی سمجھتا ہے اور اپنے بڑے بھائی کی قوت اور بڑکپن سے مقابلہ کے لئے، وہ یہ سب کرتا ہے۔

والدین کو کوشش کرنا چاہیے کہ وہ خود ہی کسی ایک کے خلاف دوسرے کا ساتھ نہ دینے لگیں، بلکہ ان کو اس آپسی جھگڑے کے سبب تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے، اگر خطا کار کا پتہ لگانے میں کامیاب نہ ہوسکیں تو پھر انھیں اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ وہ ہر بچے کو دوسرے کے نقطۂ نظر کا خیال رکھنے پر آمادہ کریں، بڑے بچے کو سمجھانا چاہیے کہ وہ اپنے بڑے اور طاقتور ہونے کا خیال رکھے، اور یہ لحاظ کرے کہ بڑوں اور طاقت وروں کو چھوٹوں اور کمزوروں کی رعایت اور ان کا احترام کرنا چاہیے۔ انھیں یہ سمجھائیں کہ یہ صرف گھر کے اندر کا کا اصول نہیں ہے بلکہ یہ اجتماعی زندگی کا عام اصول ہے، والدین کو یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بڑے بچے کے لئے یہ اس قدر آسان نہیں ہے، اس لیے کہ بسا اوقات چھوٹا بچہ زیادہ عاجز کرتا ہے اور زیادہ پریشان کرتا ہے، لیکن پھر بھی انھیں بڑے بچے کو ذمہ داری اور واجبات کا احساس دلانا چاہیے تاکہ وہ اس سے سبق حاصل کرے، اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے اور اس کو صبر کی تلقین کرنا چاہیے، والدین بڑے بچے سے یہ بھی کہیں کہ جب وہ صبر کرنے کی کوشش کرے مگر اپنے آپ پر اس کے لیے قابو پانا مشکل ہوجائے تو وہ فوراً آکر والدین کو مطلع کردے کہ اب اس کے لیے صبر کرنا ممکن نہیں ہے۔

ٹھیک اسی طرح والدین کو چاہیے کہ وہ چھوٹے بچے کی بھی ذہن سازی کریں، اس کو سکھائیں کہ بڑے بھائی/ بہن کے حقوق ہیں اور ان کا احترام لازم ہے، یہ غلط بات ہے کہ چھوٹا بڑے کو پریشان کرے اور پھر اس کو انتقام پر آمادہ کرے، اس کو سمجھائیں کہ یہ اچھی اور انصاف کی بات نہیں ہے کہ وہ ہلکی سی خراش کو والدین کی توجہ اور شفقت حاصل کرنے کے لئے بڑی بنا کر پیش کرے، تاکہ وہ بڑے بھائی کو والدین کے سامنے زیر کرسکے، اس کو سمجھائیں کہ اگر بڑا چھیڑ چھاڑ شروع کرتا ہے تو اس کو چاہیے کہ فوراً آکر والدین سے شکایت کرے، لیکن والدین کے لیے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ کسی ایک کا ساتھ نہ دیں یا کسی ایک کی حمایت میں نہ کھڑے ہوجائیں، والدین کے اس طرح کے تعامل سے بچے ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا طریقہ سیکھیں گے، اور پھر اپنے درمیان اس طریقے سے بہتر اور مضبوط تعلقات قائم کرسکیں گے۔

عام طور پر ان بھائی بہنوں میں اس طرح کے جھگڑے زیادہ ہوتے ہیں جن کی عمروں میں دو سال کا فرق ہوتا ہے، یہی فرق اگر دو

سال سے کم ہوتا ہے تو عام طور سے وہ مل جل کر رہتے ہیں، اس اتفاق کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر تمام امور میں ان کا نظریہ یکساں ہوتا ہے اور ان کی دلچسپی میں بھی یکسانیت ہوتی ہے، اگر یہی فرق دو یا تین سال کا ہوتا ہے تو پھر عام طور پر بڑا بچہ ذرا پختہ ہوتا ہے اور وہ چھوٹے بھائی کی حرکتوں سے اکتاتا ہے، وہ اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس کی حمایت کرتا ہے لیکن یہ کوئی عام قاعدہ نہیں ہے۔

والدین کی یہ کوشش ہونا چاہیے کہ اپنی طرف سے خطا کار بچے کو سزا دینے میں جلدی نہ کریں، بالخصوص تب جبکہ وہ پورے قصے سے واقف نہ ہوں اور واقعہ انجام پانے کے وقت خود دیکھا نہ ہو، ایسے موقع پر اگر محض ایک کے دعوی کے سبب دوسرے کو سزا دی گئی تو پھر ان کے درمیان غضب وانتقام کی نفسیات جنم لے گی، اور اگر ایسا ہوا کہ والدین اس بچے کو سزا دے بیٹھے جو درحقیقت بری تھا مگر دوسرے کے دعوے نے اسے مجرم بنا دیا تو پھر یہ بچے سب کے سب والدین کے حسن تصرف اور ان کی حکمت کے بارے مشکوک ہوجائیں گے، اس لیے ہمیشہ والدین کو بچوں کے درمیان اچھے تعلقات فروغ دینے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے بجائے اس کے کہ وہ سزا دینے پر توجہ دیں، البتہ وہ تھوڑی دیر کے لئے بچوں کو الگ الگ کر سکتے ہیں، اور پھر ان کو اس معاملہ میں اپنے نقطۂ نظر سے واقف کرا سکتے ہیں، والدین کو چاہیے کہ وہ فوری طور پر معاملہ کو رفع دفع کریں اور پھر بچوں کو سکھائیں کہ اختلافات اور جھگڑوں کو حل کرنے کے لیے اور بھی بہتر طریقے ہیں۔

عام طور پر جو بات رائج ہے اور جس سے مزید اشکال پیدا ہوتا ہے اور بچوں کے آپسی تعلقات بھی جس کے سبب خراب ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ والدین بچوں کے درمیان ایک کا دوسرے سے موازنہ کرنے لگتے ہیں، مثلا کہتے ہیں ''کتنی خراب بات ہے کہ تم اپنے بھائی کی طرح نہیں بن سکتے'' یا ''تمہارا بھائی جب تمہاری عمر میں تھا تو تم سے بہت بہتر تھا'' یا ''تم اپنے بھائی کے بالکل برعکس ہو، شروع ہی سے وہ فرمانبردار تھا، میں جب بھی اس سے کچھ کہتا تھا وہ اطاعت کرتا تھا''، اس طرح کی گفتگو سے بچے کے اندر گناہ اور خطا کا احساس پیدا ہوتا ہے، اور اس کے اندر اپنے بھائی کے لیے ناراضگی اور نفرت آمیز جذبات جنم لیتے ہیں، یہی نہیں بلکہ اگر بار بار اس طرح کی گفتگو کی جائے تو باوجود بھائی کی بعض اچھی صفات کے وہ اس کی اقتدا سے نفرت کرتا ہے اور اس کے تشابہ کو ناپسند کرنے لگتا ہے، اس کے اندر یہ خیال جنم لیتا ہے کہ والدین اس کے حق میں منصف نہیں ہیں، اس انداز تربیت سے والدین خود بھائیوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں اور فرق پیدا کر دیتے ہیں، موازنہ کرنے کے اس عمل سے والدین کا سکون بھی غارت ہوتا ہے، کیوں کہ وہ بچے سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے بھائی سے سیکھے، اس کی چیزوں کو اپنائے اور بچہ ضد میں آکر ہمیشہ اس مطالبہ کی خلاف ورزی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے، گویا وہ اس مخالفت کے ذریعہ اپنے بھائی سے انتقام لیتا ہے اور والدین اس پر جو وار کرتے ہیں وہ اس مخالفت کے ذریعہ سے اس کا جواب دیتا ہے، لہذا جب موازنہ کا یہ عمل یکسر مفید ہی نہیں ہے تو اس سے بچنا لازمی ہے۔

بالفرض اگر والدین کو معلوم ہو کہ ان کا کوئی بچہ دوسرے کے بالمقابل کمزور وکمتر ہے لیکن انھیں اسے قبول کرنے اور اس سے اظہار محبت کا طریقہ نہ معلوم ہو تو مذکورہ بالا موازنہ کے طرز عمل سے وہ معاملہ کو مزید پیچیدہ بنا دیں گے، یقیناً والدین کی خواہش ہوگی کہ کاش یہ بچہ دوسرے کی طرح ہوتا، مگر صحیح یہ ہے کہ وہ اس بچے کو اسی حال میں قبول کریں، یہ صحیح ہے کہ والدین اور بچوں کے درمیان تعلقات متعدد اسباب کی بنا پر مختلف ہوتے ہیں، لیکن اس کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے محبت دوسرے کی محبت سے کم یا زیادہ نہ ہو، یہ ضروری ہے کہ والدین اپنے بچے کی دوسرے بچے کی جگہ آرزو نہ کریں یعنی یوں اظہار نہ کریں کہ کاش یہ بچہ فلاں کی طرح ہوتا یا فلاں اس کی جگہ میرا بچہ ہوتا، بالکل اسی طرح جیسے بچے کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنی ماں کی جگہ دوسری عورت کو ماں بنانے یا باپ کی جگہ دوسرے مرد کو باپ بنانے کی خواہش کا اظہار کرے۔

☆☆☆

❑ اصلاح معاشرہ

شادی بیاہ کی غیر شرعی خرافات کا سدِّ باب کیسے ہو؟

سید احمد ومیض ندوی
استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد

گذشتہ ۲۳؍جنوری ۲۰۱۸ء کو شادیوں میں اسراف اور بے جا رسومات اور وقت کی پابندی کو یقینی بنانے کے لیے صدر نشین تلنگانہ اسٹیٹ وقف بورڈ کی قیادت میں شہر کے علماء، دانشوران اور عمائدین ملت کا جو مشاورتی اجلاس منعقد ہوا اس کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے، یہ ایک مستحسن اور خوش آئند اقدام ہے، اجلاس میں جتنے امور زیر بحث لائے گئے ان سب کا تعلق نظامِ نکاح میں درآئی خرافات اور شادی بیاہ کی غیر شرعی رسومات سے ہے، نکاح کے حوالہ سے مسلمانوں میں پایا جانے والا بگاڑ اب ساری حدوں کو پار کرتا جارہا ہے، پانی اب سر سے اونچا ہو چکا ہے، اس سلسلہ میں فوری انسدادی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو مسلم معاشرہ تباہی کے دہانے پر پہنچ سکتا ہے۔

جہیز کی غیر اسلامی وغیر انسانی رسم کے سبب ملت کی ہزاروں بیٹیاں جوانی کی عمریں پار کررہی ہیں، ہزاروں غریب اور متوسط خاندان جہیز نہ دے سکنے کے سبب زندگی کے سکون سے محروم ہیں، جس گھر میں ایک سے زائد شادی لائق جوان بیٹیاں موجود ہیں، وہاں کے سرپرستوں کی رات کی نیندیں اُڑ چکی ہیں، بہت سی غربت کی ماری بچیاں غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ فرار ہورہی ہیں اور اپنے دین وایمان کا سودا کررہی ہیں، بعضے لڑکیاں شادی میں تاخیر یا شادی سے مایوس ہوکر خودکشی کر بیٹھ رہی ہیں، جہیز کی لعنت نے ہزاروں خاندانوں کو اُجاڑ کے رکھ دیا ہے، جہیز کم لانے کی پاداش میں سیکڑوں نئی نویلی دلہنوں کو نذرِ آتش کیا جاچکا ہے، جہیز کے لالچی والدین نے شادی جیسے مقدس عمل کو تجارت بنالیا ہے، لڑکوں کی جہاں جتنی زیادہ بولی لگتی ہے وہاں ترجیح دی جاتی ہے، دین واخلاق کو بنیاد بنانے کے بجائے مال ودولت کو رشتوں کے لیے معیار ٹھہرایا جارہا ہے، دین داری اور شرافت کو بالائے طاق رکھا جارہا ہے، رشتوں میں تاخیر کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں فحاشی، بے حیائی اور جنسی بے راہ روی میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے، زنا وبدکاری کے نت نئے راستے کھل رہے ہیں، سسرال سے ملنے کی امید میں نوجوان سستی اور کاہلی کے عادی ہورہے ہیں، محنت اور کسبِ حلال سے جی چرا رہے ہیں، جہیز کا مطالبہ دراصل گداگری ہی کی ایک شکل ہے، اسلام میں بلاضرورت شدیدہ کے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا ممنوع ہے، جہیز کی لعنت نے معاشرہ میں مانگنے اور سوال کرنے کی منحوس رسم کو رواج دیا ہے، یہ اور اس طرح کی بے شمار خرابیاں ہیں جو جہیز کی کوکھ سے جنم لے رہی ہیں، اور پورے معاشرہ کو آلودہ کررہی ہیں۔

شادی کی غیر شرعی خرافات کا ایک نقصان وقت کے ضیاع کی شکل میں ہورہا ہے، وقت انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، زندگی کا ہر لمحہ بیش قیمت متاع ہے، اسی سے دنیا بھی بنتی ہے اور آخرت بھی سنورتی ہے، اسی کی قدردانی سے قوموں کا مستقبل روشن ہوتا ہے اور ناقدری سے نسلیں برباد ہوتی ہیں، حیدرآباد شہر کی شادیاں کیا ہوتی ہیں ضیاع اوقات کا ایک سامان ہوتا ہے، ۱۲؍بجے سے قبل نوشہ میاں کا شادی خانہ میں رونق افروز ہونا ناممکن ہے، شادی کے رقعہ میں بعد عشاء درج ہوتا ہے، کوئی وقت کا قدرداں اس وقت پہنچ جاتا ہے تو شادی خانہ اسے چڑانے لگتا ہے، مساجد میں نکاح کا رواج

بڑھ رہا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے اور اس سے نکاح تو وقت پر ہو جاتا ہے، لیکن شادی خانہ پہنچ کر ساری خرافات اپنائی جاتی ہیں، رات دیر گئے نکاح کی تقریب منعقد کرنا ایک فیشن بنتا جا رہا ہے، جب کہ یہ چیز نہ عقلاً درست ہے اور نہ ہی شریعت میں اس کی گنجائش ہے، رات کو اللہ نے سونے کے لیے بنایا ہے، قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ ایک قدرتی نظام ہے جو اس نظام قدرت کو توڑتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے، نبی رحمت ﷺ کا معمول تھا کہ آپ عشاء کے بعد جلد استراحت فرماتے اور تہجد میں بیدار ہوتے، احادیث شریفہ میں عشاء کے بعد غیر ضروری گپ شپ میں لگنے اور دیر سے سونے سے منع کیا گیا ہے، رات دیر تک شادی خانوں کو آباد رکھنے اور کھانے میں غیر ضروری تاخیر کرنے کے بے شمار نقصانات ہیں، اس سے دعوت میں شریک معمر افراد اور بیماروں کو زحمت ہوتی ہے، شرکاء میں بہت سے شوگر کے مریض ہوتے ہیں جن کے لیے کھانے میں تاخیر سے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جیسے جیسے کھانے میں تاخیر ہوتی جاتی ہے ان کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے، حتی کہ بعض ضعیف مریض بیہوش ہو جاتے ہیں، علاوہ ازیں رات تاخیر سے کھا کر پھر فوراً سو جانا صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے، اولاً تو شادی کی دعوتوں میں غذائیں انتہائی مرغن ہوتی ہیں جو معدہ کو بوجھل کر دیتی ہیں، پھر اس پر مستزاد یہ کہ کھانے کے بعد بغیر ٹہلے سویا جاتا ہے جس سے معاملہ مزید سنگین ہو جاتا ہے، ایک رپورٹ کے مطابق شوگر اور بی پی کا تناسب مسلمانوں میں دیگر قوموں کے مقابلہ میں زیادہ ہے اور پھر ایسے مریضوں کی سب سے زیادہ تعداد شہر حیدرآباد میں ہے، یہ دراصل یہاں کی شادیوں کا شاخسانہ ہے، صحت جیسی عظیم نعمت کو اپنے ہاتھوں سے برباد کر لینا کونسی دانشمندی ہے؟ مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی بیماریوں کا بنیادی سبب ان کی بے ڈھنگی دعوتیں اور شادی کی تقریبات ہیں، رات دیر تک شادی تقاریب کا سلسلہ فرائض کے ضیاع کا بھی سبب بنتا ہے، دو ڈھائی بجے رات گھر لوٹنے والے اکثر افراد نماز فجر کو چھوڑ کر سوتے پڑے رہتے ہیں جو بہت بڑی نحوست ہے، جس گھر میں چھوٹے بڑے مرد وخواتین سب نماز سے غافل ہو کر سوتے پڑے رہیں وہاں خیر و برکت کیسے آسکتی ہے؟ دین اسلام صبح کو جلد اٹھنے اور بعد فجر کسب حلال کے لیے تگ و دو کی تلقین کرتا ہے، رسول اکرم ﷺ نے اپنی امت کے لیے صبح کے کاموں میں برکت کی دعا فرمائی ہے، دن چڑھے سو کر کاروبار جانے والوں کے لیے خیر و برکت کیسے مقدر ہوگی؟ رات دیر تک جاگنے سے دوسرے دن کی سرگرمیاں متاثر ہوتی ہیں، بچے صبح اٹھ کر اسکول جا نہیں پاتے، گھر کے ذمہ دار افراد وقت پر کام کرنے سے قاصر رہتے ہیں، کاروبار وقت پر شروع نہ ہونے سے ملت کی معیشت تباہ ہوتی ہے، وقف بورڈ کے حالیہ اجلاس میں رات ۱۲/ بجے تک شادی تقاریب ختم کرنے کی جو تجویز منظور کی گئی وہ نہایت موزوں ہے، نکاح ترجیحاً عشاء تک ہر صورت میں کر دیا جائے اور عشاء کے فوری بعد عشائیہ ترتیب دیا جائے، قاضی صاحبان کو ۹/ بجے شب کے بعد نکاح نہ پڑھانے کے لیے پابند کیا گیا ہے، یہ سب مناسب تجاویز ہیں، بشرطیکہ ان پر عمل ہو۔

نکاح اور شادی میں رائج خرافات کا ایک دینی نقصان یہ ہے کہ ان سے بے حیائی، بداخلاقی اور بے پردگی عام ہو رہی ہے، نکاح ایک مقدس تقریب ہے اور سنتِ رسول ہے اسے ہر قسم کی خلاف شرع باتوں سے پاک ہونا چاہیے؛ لیکن دیکھا یہ جا رہا ہے کہ شادی خانوں میں نہ صرف بینڈ باجے کا اہتمام ہوتا ہے؛ بلکہ ڈی جے (D.J) اور نیم برہنہ خواتین کا رقص بھی ہونے لگا ہے، حتی کہ دلہے کے ساتھ ہونے والے رقص میں تلواریں بھی گھمائی جانے لگی ہیں، گذشتہ دنوں شہر حیدرآباد میں رسم کی ایک تقریب میں تلوار کے ساتھ رقص کے دوران تلوار کی زد میں آکر ایک طالب علم جاں بحق ہو گیا، رائے درگم درگاہ حسین شاہ ولی کے قریب رہنے والا دسویں جماعت کا طالب سید حمید رسم کی تقریب میں ناچ گانے کے دوران تلوار لگنے سے ہلاک ہو گیا، رسم کی تقریب کی بارات باجے کے ساتھ دلہن کے گھر جا رہی تھی جس میں ایک نوجوان تلوار کے ساتھ رقص کر رہا تھا، بارات میں شامل سید حمید رقص کا نظارہ کر رہا تھا کہ تلوار اس کے گلے پر لگ گئی اور ہسپتال جاتے ہوئے راستہ ہی میں

وہ دم توڑ گیا، حیدرآبادی مسلم معاشرہ کے لیے یہ کس قدر شرمناک بات ہے کہ بیہودہ ناچ گانے کی وجہ سے ایک لڑکے کی جان چلی گئی، کیا ہمیں نہیں معلوم کہ رقص وسرور اور ناچ گانے کا اسلامی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ دراصل دشمنان خدا ورسول کی تہذیب ہے، ہماری شادی بیاہ کی تقریبات ان ساری خرافات سے پاک ہونا چاہیے، موسیقی، بینڈ باجا، ڈی جے اور نیم برہنہ رقص جیسی چیزیں خدا کے غضب کو دعوت دیتی ہیں، وقف بورڈ کے مشاورتی اجلاس کی یہ تجویز بہت مناسب ہے کہ بارات میں کسی قسم کی آتش بازی اور اسلحہ کا مظاہرہ کرنے پر آرامس ایکٹ کے تحت مقدمہ درج کیا جائے گا، ایسے ناچ گانے کا ایک سماجی نقصان یہ ہے کہ اس سے گھروں میں موجود معمر افراد، بیمار اور اطراف کے پڑوسیوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے، اسلام میں ایذائے مسلم حرام ہے، اس سے بچنے کی سخت تاکید کی گئی ہے؛ لیکن موجودہ دور کی شادیاں محلے والوں کے لیے آفت بنتی جارہی ہیں، جس محلّہ میں شادی خانہ ہوتا ہے وہاں کے مکینوں کا جینا دوبھر ہوجاتا ہے اور ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں، پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ ایسی بیہودہ حرکتوں پر خاموشی اختیار کرکے ہم اپنی نئی نسل کو کیسا غلط پیغام پہنچارہے ہیں، ناچ گانے کی رسیا نسل سے کیا کسی بڑے کارنامے کی توقع کی جاسکتی ہے؟

شادی بیاہ کی خرافات کا ایک نقصان فضول خرچی اور اسراف ہے، نمائش اور دکھاوے کے لیے لوگ نکاح کی دعوتوں میں لاکھوں روپئے لٹاتے ہیں، لاکھوں کے شادی خانے حاصل کیے جارہے ہیں اور کھانے میں دسیوں آئٹموں کا اہتمام کیا جارہا ہے، پرشکوہ تقاریب کو سماج میں عزت اور انا کا مسئلہ بنالیا گیا ہے، جب کہ اسلام میں شادی کو سادی بنانے کا حکم ہے، نبی رحمت ﷺ نے اس نکاح کو سب سے بابرکت قرار دیا ہے جس میں کم سے کم مالی خرچ ہو، شادی میں صرف ولیمہ مسنون ہے، نکاح کے موقعہ پر کسی قسم کا کھانا مسنون نہیں ہے، مال ودولت اللہ کی امانت ہے، اسے حقوق کی ادائیگی اور دینی کاموں میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔

وقف بورڈ کی جانب سے شادی بیاہ کی خرافات کے خلاف اٹھایا گیا اقدام قابل ستائش ہے، لیکن اصل مسئلہ اجلاس میں منظورہ قرار دادوں کو عملی جامہ پہنانے کا ہے، اس سلسلہ میں درج ذیل باتوں پر توجہ دینا ضروری ہے:

۱- عام مسلمانوں میں دینی شعور بیدار کیا جائے، صرف قانون سازی کافی نہیں ہوگی، نکاح کے تعلق سے عامۃ المسلمین کو بتانے کی ضرورت ہے کہ نکاح عبادت ہے اور عبادت کے لیے ہر مسلمان نبی رحمت ﷺ کے طریقہ کا پابند ہے، کسی بھی عمل کے عبادت بننے کے لیے اسے منہج رسول پر انجام دینا ضروری ہے، بیشتر مسلمان نکاح کو عبادت نہیں سمجھتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے نکاح کے معاملہ میں خود کو شریعت سے آزاد سمجھ رکھا ہے۔

۲- اسلام میں غیروں سے مشابہت کی سخت ممانعت ہے، حتی کہ جو شخص کسی دوسری قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے کل قیامت کے دن اس کا حشر اسی قوم کے ساتھ ہوگا، شادی بیاہ میں رائج ساری خرافات دراصل غیر مسلم سماج سے مسلمانوں میں آئی ہیں، جہیز اور دیگر رسومات غیر مسلم معاشرہ کی دین ہے، عام مسلمانوں کو بتایا جائے کہ اسلام میں غیروں سے مشابہت کی قطعی اجازت نہیں ہے۔

۳- شادی بیاہ کی خرافات کے خاتمہ کے لیے برسوں سے آواز اٹھائی جارہی ہے؛ لیکن بظاہر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا، ضرورت اس بات کی ہے کہ خرافات کے سد باب کے لیے سماجی بائیکاٹ کو بطور ہتھیار استعمال کیا جائے، حالیہ مشاورتی اجلاس میں بائیکاٹ کا مشورہ بھی سامنے آیا ہے اور بعض معاملات میں حکومتی سطح پر سزا کی بھی تجویز رکھی گئی ہے، یہ ایک اچھی پیش رفت ہے، اس مہم کو مستقل جاری رکھنے کی ضرورت ہے، اخیر میں یہ بات ذہن میں رہے کہ خوفِ خدا اور آخرت میں جواب دہی کے احساس کے بغیر آدمی خلافِ شرع چیزوں کو نہیں چھوڑ سکتا، ضرورت اس بات کی ہے کہ ائمہ وخطباء اور دعوت واصلاح کے ذمہ دار عام مسلمانوں میں خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی روح پیدا کریں۔

☆☆☆

❑ نقطۂ نظر

کثیر جہتی تہذیب اور افکارِ سعید نورسی

ندیم احمد انصاری
شعبۂ اردو، اسماعیل یوسف کالج، ممبئی

شیخ بدیع الزماں سعید نورسی نے خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور میں زندگی گزاری۔ان کی ولادت ترکی کے ایک گاؤں نورس میں ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی۔ ان کی پوری زندگی بالخصوص ۱۹۲۶ء کے بعد سے وفات (مارچ ۱۹۶۰ء) تک تقریباً تینیس سال جہدِ مسلسل اور گہری فکر ونظر میں بسر ہوئی۔ان کی تحریروں میں اہلِ وطن کے لیے اپنائیت کا جذبہ موجزن ہے اور یہ تحریریں کثیر جہتی تہذیب کو توانا کرتی نظر آتی ہیں۔وہ بہ یک وقت میدانِ عمل کے غازی اور دین و وطن کے لیے مخلص سرفروشی کی تمنا رکھنے والے گرم جوش مفکر تھے۔ان کا زمانہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی پر مشتمل ہے، جو کہ دورِ جدید کا نہایت اہم مرحلہ ہے۔شیخ نورسی کی تحریروں میں موجود افکار کثیر جہتی تہذیب کے پودے کو توانائی بخشتے ہیں،اوران کی تحریریں تنگ نظری،تعصب اور تشدد سے دور نظر آتی ہیں۔انھوں نے ساری زندگی حق کا علم بلند رکھا، جس کے لیے انھیں ربع صدی تک زنداں کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔

شیخ نورسی کا بڑا کارنامہ ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے 'رسائلِ نور' اور لاکھوں کی تعداد میں تربیت یافتہ طلبۂ نور ہیں، بلکہ جدید ترکی میں اسلامی بیداری انھیں کی مرہونِ منت ہے۔رسائلِ نور میں مذہبی موضوعات کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی وسیاسی مسائل پر جابہ جا رہنمائی ملتی ہے۔شیخ نورسی نے اپنی تحریروں سے حیاتِ انسانی کو نئی روشنی عطا کی اور کمیونزم کے دور دورے میں بھی لوگوں کے قلوب و اذہان میں روحانی و وجدانی زندگی کے خوابیدہ انسانی پہلوؤں میں تحریک پیدا کرنئی روح پھونکی۔انھوں نے اُخروی پہلوؤں کے حامل مضبوط تعلقات کو منظرِ عام پر لانے کی تگ و دو کی اور خانقاہوں و مدارس کی برکات سے ایک ایسے نامسعود دور میں عوام کو روشناس بلکہ سرفراز کیا جس میں فنون وفلسفے کا غلط استعمال کر کے انسانیت کو الحاد کی طرف دھکیلنے کی پیہم کوششیں کی جارہی تھیں۔

شیخ نورسی ماننا ہے کہ مذہب ایک درخشندہ اور کائناتی حقائق کا مجموعہ ہے،جس کی چمک میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہ اپنی حکمرانی تمام زمان ومکان تک وسیع کرتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے نہ صرف مذہب کی محدود اور تنگ نظر تعبیر وتشریح کے طور طریقوں کی شدت سے مخالفت کی بلکہ ٹھوس اور پختہ اقدام کے طور پر اس کی عالمانہ اور کثیر الجہات تعبیریں بھی پیش کیں تا کہ مذہبی حقائق کی شعائیں انسانی دل ودماغ تک پہنچ سکیں۔اس طرح انھوں نے انتہا پسندی سے دوری اختیار کرتے ہوئے مذہب کی حقیقت تک پہنچنے کا ایک مختصر،محفوظ اور لچک دار راستہ اپنایا۔[۱]

شیخ نورسی کا نقطۂ نظر شمولیت پسندی، وسیع ظرفی اور غیر جانب دارانہ رویے پر مشتمل ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے ماحول میں جب کہ

مغرب اور اس کی تہذیبی برتری کو دین داری کی سب سے بڑی علامت تصور کیا جانے لگا، شیخ نورسی کی فکر میں قرآن کے تصورِ عدل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيـنَ آمَـنُـواكُـونُوا قَوَّامِينَ لِلّـهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ، وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا۔[۲]

اے ایمان والو! خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔

شیخ نورسی نے اس ہدایت پر پورا پورا عمل کیا اور ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کی کوشش کی جس میں انتہا پسندی کو باریابی نصیب نہ ہو۔ اس کے علاوہ انھوں نے انسان کے اخلاق پر خصوصی توجہ مبذول کی، اس لیے کہ انسان کا انفرادی طور پر بھی محاسنِ اخلاق سے مزین ہونا سماج و معاشرے کے حسن کی ضمانت ہے۔ جس سماج کے افراد کے اخلاق عمدہ نہ ہوں، اس سماج کی عمدگی کے بارے میں سوچنا بھی محض خام خیالی ہے اور اخلاق کی درستگی میں اعمال کی جزا و سزا کو بڑا دخل ہے۔ جو معاشرہ جزا و سزا سے ناامید و بے خوف ہوتا ہے، اس میں سلامتی کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ شیخ نورسی کے مطابق:

''مرنے کے بعد کا عقیدہ زندگی کے استحکام کا سبب بنتا ہے، ورنہ سماجی زندگی بحران کا شکار ہو جاتی ہے۔ سماج میں بچّے ہیں، جوان ہیں، بوڑھے ہیں اور سماج کی اکائی خاندان ہے۔ جنت کا عقیدہ اگر نہیں ہوتا تو موت کو دیکھ کر بچوں پر برے اثرات پڑتے، وہ ڈر جاتے۔ اسی طرح یہ آخرت کی ابدی زندگی کا نظریہ ہی ہے جو بوڑھوں کو مایوسی سے بچاتا ہے، اور اسی طرح جہنم کا عقیدہ ہی ہے جو نوجوانوں کو ظلم کرنے اور فتنہ و فساد پھیلانے سے روکتا ہے۔ خاندان جو کہ ایک چھوٹی سی دنیا کی طرح ہے، اس میں حقیقی و سچی عزت، محبت، ہمدردی، قربانی تب ہی قائم رہ سکتی ہے جب خاندان کے سبھی افراد یہ یقین رکھیں کہ وہ ایک ابدی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔''[۳]

اس اقتباس میں نہایت اعلیٰ و بلند خیالی کے ساتھ اسلامی تعلیمات اور عقیدۂ آخرت کو کثیر جہتی تہذیب کی صلاح و فلاح سے جوڑ کر عظیم پیغام دینے کی کوشش کی گئی اور یہ بتایا گیا ہے کہ صرف آخرت کا عقیدہ ہی ہے، جو دنیا کو جہنم بننے سے بچا سکتا ہے۔

شیخ نورسی نے ایک مفکر کی طرح مسائل کا حل تلاش اور ایک ماہر طبیب کی طرح امراضِ قوم کی تشخیص و علاج کا نازک کام انجام دیا ہے اور قوم کے فکری اضمحلال اور معاشرتی پریشانیوں کو دور کرنے کی تدبیریں کی ہیں۔ انھوں نے پرشکوہ مگر زوال پذیر ریاست کو اس کے طویل اور زرخیز ماضی سے سبق سیکھنے کی ترغیب دی ہے، کیوں کہ انھوں نے خلافتِ عثمانیہ کے زمانے سے ہی ملک کے طول و عرض میں دورے کیے تھے اور بڑے بڑے شہروں اور دور دراز دیہاتوں میں یہ مشاہدہ کیا تھا کہ لوگ جہالت کی تاریکی میں غرق ہونے کے باوصف مختلف النوع اختلافات میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کو نہ صرف زیر کرنے بلکہ کھسوٹ ڈالنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اسی کے پیشِ نظر انھوں نے قوم میں علم کی ضیاپاشیاں عام کرنی کی طرف اور غربت، ضرورت اور معیشت کے مسائل پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

شیخ نورسی نے فرقہ واریت کے تدارک کے لیے وحدتِ امت کا علم بلند کیا اور ترکی میں اسلامی خلافت کے خاتمے کی اصل وجہ خود ساختہ قوم پرستی کو قرار دیا، جس کے لیے انھوں نے اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے استنباط و استدلال کیا۔ انھوں نے قومیت کا اسلامی تصور پیش کرتے ہوئے کہا کہ تمام مذاہبِ عالَم میں صرف اسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے ہر کام میں نہایت اعتدال قائم رکھا ہے۔ اسلام سے قبل دنیا میں ظلم و جبر اور ذات پات، رنگ و نسل کا امتیاز رائج تھا، حتّٰی کہ جرائم کی سزائیں بھی

شخصیات وخاندان کے تفاوت سے مختلف ہوتی تھیں، لیکن جب رب العالمین نے رحمۃ للعالمین کو دنیاے انسانیت کی طرف بھیجا اوراعلان فرمایا:

خلقكم من نفس واحدة.[۴]

یعنی تمھیں ایک ہی ذات سے پیدا کیا ہے۔

اوراس کی تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشادفرمایا:

يـايهـا الـنـاس! الا، ان ربكم واحد، وان اباكم واحـد، الا! لافـضـل لـعـربى على عجمى، ولا لعجمى عـلـى عـربـى، ولا لأسـود على احمر ولا لأحمر على اسود الا بالتقوى.[۵]

اے لوگو، غور سے سن لو! تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ ایک ہے۔ خبردار! کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر یا کالے کو سرخ پر اور سرخ کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

اور خاندانی امتیازات کے مقصد اور غرض وغایت کو واضح کرتے ہوئے ارشادفرمایا گیا:

يَـا أَيُّهَـا الـنَّـاسُ اِنَّـا خَـلَقْنَـاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثٰى وَجَـعَـلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا، اِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ.[۶]

لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت (یعنی ایک ماں باپ/آدم وحوا) سے پیدا کیا اور تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:

ليس منا من دعا الى عصبية ، وليس منا من قاتل على عصبية، وليس منا من مات على عصبية.

وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی طرف بلائے اور اس کی آواز بلند کرے، وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی وجہ سے جنگ کرے، وہ ہم میں سے نہیں جس کی موت عصبیت پر آئے۔[۷]

یعنی اس حال میں مرنا کہ اس کے دل میں علاقائی، لسانی، خاندانی، قبائلی، ملکی، قومی، مسلکی یا کسی بھی طرح کی عصبیت پائی جاتی ہو، اسے اسلام نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا، ہاں یہ ضرور واضح کر دیا کہ کسی کے تئیں کسی خاص تعلق سے نرم گوشہ رکھنا اس مذمت میں داخل نہیں۔

عَـنْ عَبَّـادِ بْـنِ كَثِيـرٍ الشَّامِيِّ عَنْ امْرَأَةٍ مِنْهُمْ يُقَالُ لَهَـا فُسَيْـلَةُ قَالَتْ سَمِعْتُ أَبِى يَقُولُ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰـهُ عَـلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ: أَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُـحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهُ؟ قَالَ: لَا وَلٰكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُعِينَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ.[۸]

عباد بن کثیر شامی سے روایت ہے، حضرت فُسیلہ فرماتی ہیں، میں نے اپنے والد کو یہ فرماتے ہوئے سنا؛ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ بھی تعصب ہے کہ آدمی اپنی قوم سے محبت کرے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں یہ تعصب نہیں بلکہ تعصب یہ ہے کہ آدمی (ناحق اور) ظلم میں بھی اپنی قوم کا ساتھ دے۔

یہ وہ اسلامی اصول واقدار ہیں، جن پر شیخ نورسی ہمیشہ کاربند رہے اور انھیں باتوں کو اپنے لٹریچر میں پیش کیا۔ ملاحظہ ہو مذکورہ مسائل کو وہ کس چابک دستی سے بہ طور نظریہ صحیح فکر کے ساتھ پیش کرتے ہیں، وہ پوری قوت کے ساتھ کہتے ہیں:

''نسلی قوم پرستی کی بنیاد پر قوموں کے درمیان اختلاف اور دشمنی پیدا کرنا، تباہی وبربادی کی دعوت دینا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مکھی سے بچنے کے لیے اپنا پاؤں زہریلے سانپ پر رکھ دے

۔''[۹]

قوم پرستی کی صحیح تعریف بیان کرتے ہوئے ، ایک مقام پر وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں:

''دوسری قسم مثبت قوم پرستی کی ہوتی ہے اور اجتماعی وجود قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ قوم پرستی باہمی امداد، مفاہمت اور استحکام کا ذریعہ ہو، اس سے حاصل ہونے والی طاقت مفید اور اسلامی اخوت کو عملی جامہ پہنانے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔''[۱۰]

مختصر یہ کہ شیخ نورسی نے اسلامی تعلیمات کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ عصبیت کے نشے میں کسی پر ظلم کرنا یقیناً مذموم ومبغوض ہے، جس کی اسلام نے کبھی اجازت نہیں دی، خواہ موقع بہ موقع مذہبِ اسلام کو اس سے متّہم کیا جاتا رہا ہو۔ یہ شریروں کی شرارت کے سوا کچھ نہیں کہ باوجود ایسی پاکیزہ تعلیمات کے وہ اسلام پر الزامات عائد کرتے ہیں۔اسی لیے عالمی پیمانے پر اسلام اور مسلمانوں کی بابت جو غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں، ان کا ازالہ کرتے ہوئے شیخ نورسی دوٹوک الفاظ میں رقم طراز ہیں:

''ہم نور اسکول کے طلبہ نے قرآن سے یہ سیکھا ہے کہ قرآن کا تصورِ عدل ہمیں اس بات کی ممانعت کرتا ہے کہ ہم اس ناؤ کو جلائیں جس میں دس قاتل اور ایک بے قصور شہری سوار ہیں، کیوں کہ اس بے قصور کے حقوق کی حفاظت ہمارا فرض ہے، تو پھر کیا کوئی شخص اس ناؤ یا گھر کو جلا سکتا ہے جس میں دس بے قصور اور ایک مجرم موجود ہے؟ کیا یہ ظلم و ناانصافی نہیں ہے۔ہم تہِ دل سے معاشرے میں امن و امان برقرار رکھنے کے متمنی ہیں، تاکہ کچھ مجرموں کی وجہ سے بہت سے بے قصور لوگوں کی جان و مال خطرے میں نہ پڑے۔''[۱۱]

اس اقتباس میں رواداری و بردباری کا جو سبق دیا گیا ہے، دراصل یہی وہ پیغام ہے جس سے کثیر جہتی تہذیب کو بقا و دوام حاصل ہوسکتا ہے اور جس سے جہالت، تنگ نظری اور شدت بلکہ انتہا پسندی کا خاتمہ ہوتا ہے جو کہ تمام تر فسادات کا سرچشمہ اور فرقہ بندی کا سبب ہے، ضرورت ہے کہ اسلام اور شیخ نورسی کے اس پیغامِ عالی شان کو عام کیا جائے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات:

[۱] معلمِ عصر سعید نورسی، البلاغ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۱۳

[۲] سورۃ المائدہ:۸

[۳] معلمِ عصر سعید نورسی، البلاغ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۳۸، ۳۹

[۴] سورۃ النساء:۱

[۵] التفسیر القرطبی:۲۹۳/۱۶

[۶] سورۃ الحجرات:۱۳

[۷] صحیح مسلم، برقم:۱۴۷۶، ۱۸۴۸

[۸] سنن ابن ماجہ، برقم:۳۹۴۹

[۹] معلمِ عصر سعید نورسی، البلاغ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۱۰۵

[۱۰] معلمِ عصر سعید نورسی، البلاغ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۱۰۵، ۱۰۶

[۱۱] معلمِ عصر سعید نورسی، البلاغ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۹۷

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: رجب طیب اردغان

مصنف: ڈاکٹر راغب السرجانی

مترجم: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

ناشر: ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، F-155، فلیٹ نمبر 204، ہدایت اپارٹمنٹ، شاہین باغ، جامعہ نگر نئی دہلی۔110025

مبصر: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

کسی خطۂ زمین میں اسلام کے عروج، زوال اور پھر عروج کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کی بہترین مثال ترکی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب پوری دنیا پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سلاطین بڑے کرّ وفر کے مالک تھے۔ ایک بڑے خطۂ زمین پر اس کی حکم رانی قائم تھی۔ دنیا کی بڑی بڑی مملکتیں اس کے سامنے لرزاں و ترساں رہتی تھیں۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ اس کی حدودِ مملکت سکڑتی اور سمٹتی چلی گئیں، دیگر ممالک اس پر شیر ہو گئے، یہاں تک کہ انھوں نے عسکری طاقت کے بل پر اس کے حصے بخرے کر دیے۔ اس عرصے میں اس کے ایک فوجی جرنل نے کچھ دم خم دکھایا۔ اس نے ترکی کے دشمنوں سے لوہا لیا اور مملکت کو بچا کر جدید ترکی کی تعمیر کی، لیکن اس نے غضب یہ کیا کہ اپنی حدودِ مملکت سے اسلام کو دیس نکالا دے دیا۔ اس نے خلافت کی قبا چاک کر دی، اسلام کا نام لینے کو جرم قرار دیا، اتنا سنگین جرم کہ اس کی سزا موت قرار پائی، اذان پر پابندی عائد کر دی، مساجد کو میوزیم اور گوداموں میں تبدیل کر دیا، دینی مدارس و مکاتب پر تالے ڈال دیے، شرعی عدالتوں کو بند کر دیا اور اوقاف کو ختم کر دیا، اسلامی کلینڈر کی جگہ مغربی کلینڈر جاری کیا، ترکی زبان کے رسم الخط کو عربی سے بدل کر لاتینی کر دیا، خواتین کے لیے حجاب پر پابندی عائد کر دی۔ الغرض اس نے سیکولرازم یعنی لادینیت کو اپنا قبلہ و کعبہ بنالیا اور اسلام کو کھرچ کھرچ کر مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن یہ تمام کوششیں ترک عوام کے دلوں سے اسلام کو محو کر دینے میں کام یاب نہ ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ بندوں کو توفیق دی کہ وہ اسلام کی شمع جلاتے رہیں اور شدید طوفانوں کے باوجود اس کی لَو کو بجھنے نہ دیں۔ انھوں نے اس راہ میں بے مثال قربانیاں پیش کیں، قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں، جلا وطنی کی زندگی گزاری، دار و رسن کو چوما، حکومت و اقتدار سے بے دخل کیے گئے، پابندیوں پر پابندیاں قبول کیں، لیکن نہ بکے، نہ تھکے، نہ اپنی راہ کھوٹی کی۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں دھیرے دھیرے ترکی میں اسلام کا کلمہ بلند ہونے لگا، مساجد کے میناروں سے اذانیں سنائی دینے لگیں، مدارس و مکاتب پھر آباد ہونے لگے، خواتین اپنی مرضی سے حجاب اختیار کرنے لگیں اور اس پر روک ٹوک باقی نہ رہی، غرض ترکی میں اسلام کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

ترکی میں اسلام کے احیاء کے میدان میں اللہ کے جن بندوں نے غیر معمولی خدمات انجام دیں ان کی طویل فہرست ہے۔ اس وقت تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ اس سلسلۃ الذہب میں ایک نمایاں نام ترکی کے موجودہ صدر رجب طیب اردوان کا ہے۔ [صدرِ ترکی کے نام کے تلفظ میں اختلافات ہیں: اردوغان، اردوگان، اردوجان، اردوان وغیرہ۔ میں نے 'اردوان' کو ترجیح دی ہے۔] اردوان نے سیاسی سطح پر کام یاب حکمت عملی اختیار کی۔ انھوں نے اسلام سے اپنی وابستگی چھپانے کی کوشش نہیں کی، لیکن اسلام کے غلبے کے لیے اقدامات بہت ہوشیاری اور دانش مندی کے ساتھ کیے۔ انھوں نے سیکولرازم کے

محافظوں اور علم برداروں سے معرکہ آرائی انہی کے اسلحے سے کی اور دھیرے دھیرے ان کے پَر کترنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ انھوں نے خدمت خلق اور رفاہی کاموں کے ذریعہ ترک عوام کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور انھیں اپنا گرویدہ بنالیا۔ انھوں نے ترکی معیشت کو استحکام بخشا، اسے نہ صرف قرضوں کے بوجھ سے نجات دلائی، بلکہ اس کا شمار قرض دہندہ ممالک میں ہونے لگا۔ اردوان ایک ایسے لیڈر کی حیثیت سے ابھرے جس کی آواز بین الاقوامی پلیٹ فارم پر سنی جاتی ہے اور اس پر توجہ دی جاتی ہے۔ انھوں نے متعدد مواقع پر اسلام کے خلاف محاذ آرائی کرنے والوں کو للکارا اور ان کی اوقات بتادی۔ ان کا تعارف ایک ایسے مسلم حکم راں کے طور پر ہوا جو دیگر ممالک میں ظلم وستم کا شکار بنائے جانے والے مسلمانوں کی حالت زار پر کُڑھتا ہے، ان پر روا رکھے جانے والے انسانیت سوز مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور مظلوم اور بے یار مددگار مسلمانوں کی دادرسی اور گلوخاصی کے لیے اپنا دستِ تعاون دراز کرتا ہے۔ ان کی شخصیت اس شعر کی مصداق بن گئی ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ان خصوصیات کی حامل شخصیت متنازعہ بن جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اردوان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مغربی ممالک کے نظریہ سازوں کو تو ان کے بارے میں منفی تبصرے ہی کرنے تھے کہ وہ ان کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے ہیں۔ ان ممالک میں بھی کیوں کر ان کو تحسین کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے جن کی اسلام دشمنی معروف ہے۔ لیکن افسوس کہ مسلم ممالک میں بھی ان کی شخصیت متنازعہ بنی ہوئی ہے اور خود ہمارے ملک میں اسلام پسند طبقہ یک رائے نہیں ہے۔ بعض لوگ انھیں کٹر اسلام پسند کہتے ہیں تو کچھ لوگ سیکولر ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ بعض حضرات ان کی مومنانہ فراست کی داد دیتے ہیں تو کچھ بدعقیدہ اور شیعیت کا حامی قرار دیتے ہیں۔ کچھ لوگ انھیں ترکی میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا امین سمجھتے ہیں تو کچھ ان کی مصلحت آمیز سست روی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ بعض حضرات انھیں عالم اسلام کے نجات دہندہ اور ہیرو کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو کچھ برملا ان سے بغض ونفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں ضرورت تھی کہ اردوان کی شخصیت کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں، ان کی زندگی کے مختلف مراحل پر روشنی ڈالی جائے، ان کی کارکردگی کا تجزیہ کیا جائے، ان کے افکار ونظریات کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے، ترکی کے بارے میں ان کے مستقبل کے منصوبوں کو طشت از بام کیا جائے اور ان کے بارے میں شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جائے۔ زیر نظر کتاب کے ذریعہ یہ ضرورت بڑی حد تک پوری ہوجاتی ہے۔

رجب طیب اردوان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جارہا ہے، لیکن یہ سب اخبارات ورسائل کی حد تک ہے۔ ان کی شخصیت کو بنیاد بنا کر کتابیں کم لکھی گئیں ہیں۔ اس صوت حال میں زیر نظر کتاب کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی یہ کہ یہ اردوان کی شخصیت اور ان کی کارکردگی کا عمدہ تعارف پیش کرتی ہے۔

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر راغب السِر جانی (ولادت ۱۹۶۴ء) کا تعلق مصر سے ہے۔ انھوں نے قاہرہ یونی ورسٹی کی فیکلٹی آف میڈیسن سے تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کا اختصاص گردہ ومجریٔ بول کی سرجری ہے۔ اس میدان میں انھوں نے مصر اور امریکہ کی یونی ورسٹیوں سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ وہ قاہرہ یونی ورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اپنے پروفیشن سے ہٹ کر وہ اسلامی تاریخ کے ممتاز اسکالر ہیں۔ انھوں نے ۵۶/ کتابیں تالیف کی ہیں، جن میں اسلامی تاریخ میں **قصة الأندلس**، **قصة تونس**، **قصة التتار**، **قصة الحروب الصليبية** اور **فلسطين و واجبات الأمة** اہمیت رکھتی ہیں۔ شخصیات پر لکھی جانے والی ان کی کتابوں میں **قصة الامام محمد بن عبد الوهاب** کے علاوہ **قصة أردوجان** قابل ذکر ہے، جس کا ترجمہ ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی نے کیا ہے۔ ڈاکٹر سرجانی

کو اپنے پروفیشن اور اسلامیات دونوں میدانوں میں اعتبار و استناد حاصل ہے۔ انھیں کئی بین الاقوامی ایوارڈس سے نوازا گیا ہے۔ وہ **الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین** کے ممبر ہیں۔

زیرِ نظر کتاب صدر ترکی رجب طیب اردوان کے بارے میں صرف سوانحی معلومات ہی فراہم نہیں کرتی، بلکہ اس سے ترکی کی تاریخ پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ وہ ترکی کے درخشاں ماضی کو بھی بیان کرتی ہے، بیسویں صدی کے ربع اول میں اس کے خلاف مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کو واشگاف کرتی ہے، خلافت اسلامیہ کے سقوط اور قومی حکومت کے قیام کی تفصیل پیش کرتی ہے، جدید ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک کی خلافِ اسلام سرگرمیوں پر روشنی ڈالتی ہے، سیکولر حکومت اور فوج کے درمیان اسلامی تحریک کی پیش رفت بیان کرتی ہے، جن حضرات نے اسلام کے تحفظ اور احیا کے لیے کوششیں کیں ان کی خدمات کا تعارف کراتی ہے۔ اردوان کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالتی ہے، سیاسی میدان میں پروفیسر نجم الدین اربکانؒ کے تجربات اور ان کے ساتھ سیاسی جدو جہد میں اردوان کی شمولیت سے بحث کرتی ہے، اردوان کے علیٰحدہ سیاسی پارٹی بنا کر انتخابات میں شرکت اور ان میں کامیابی حاصل کر کے حکومت کی تشکیل پر روشنی ڈالتی ہے۔ اردوان کے حکومت میں آنے سے قبل ترکی کے کیا احوال تھے؟ اردوان کے بعد ان میں کیا تبدیلی آئی؟ اردوان کی پارٹی **حزب العدالة و التمنية** کے مختلف ادوارِ حکومت میں ترکی کی داخلی اور خارجی سیاست میں کیا ارتقا ہوا؟ اردوان کی سربراہی میں مستقبل میں ترکی سے کیا امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں؟ کتاب میں ان تمام سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ''یہ کتاب دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف کا اسلوب خالص تجزیاتی ہے۔ انھوں نے بے شمار تحریروں اور خبروں کا تتبع کیا ہے۔ کتاب کے مطالعے کے بعد حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے تو لگتا ہے کہ مصنف نے قبل از وقت جن امور پر رائے دی تھی، ترکی ان ہی کی طرف بڑھ رہا ہے، وہ امور اسی طرح انجام پا رہے ہیں''۔ (ص ۲۴، مقدمۂ مترجم)

مدرسۃ العلوم الاسلامیۃ علی گڑھ کے مہتمم اور ماہ نامہ 'ندائے اعتدال' کے مدیر ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے عربی زبان کی اس قیمتی اور اہم کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے ترجمے میں بہت روانی اور سلاست ہے۔ اگر ترجمہ کی صراحت نہ ہو تو اس پر طبع زاد تحریر کا گمان ہوتا ہے اور یہی ایک کام یاب مترجم کی پہچان ہے۔

فاضل مترجم کی محنت اس کتاب میں ترجمے سے بڑھ کر ہے۔ انھوں نے مقدمۂ مترجم میں، جو سولہ (۱۶) صفحات پر مشتمل ہے، ترکی کے موجودہ حالات پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ترکی کے خلاف عالمی طاقتوں کی جانب سے کس طرح سازشوں کا جال بُنا جا رہا ہے؟ اردوان کو کن مشکلات کا سامنا ہے؟ ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے وہ کیا تدابیر اختیار کر رہے ہیں؟ ان سے مستقبل میں کیا امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں؟ ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔

عربی کتاب پہلی مرتبہ ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ مترجم کے پیش نظر کتاب کا چوتھا ایڈیشن رہا ہے، جو ۲۰۱۲ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ پانچ برس کے عرصے میں عالمی حالات تیزی سے بدلے ہیں اور ترکی میں بھی بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اس لیے فاضل مترجم نے بہ طور ضمیمہ اپنی ایک تحریر [۴۶ صفحات] بھی شامل کر دی ہے، تاکہ ۲۰۱۲ء کے بعد سے اب تک ترکی کی صورت حال، اردوان کی کارکردگی اور مختلف ایشوز پر ان کا نقطۂ نظر واضح ہو جائے۔ یہ دراصل مترجم کی وہ تحریریں ہیں جو وہ اپنے مجلّہ 'ندائے اعتدال' میں وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ہیں۔

اس کتاب کی ایک اور خوبی ہے، جس کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کوئی شخص کسی کتاب کا ترجمہ کرے، لیکن اسے کتاب کے موضوع سے جذباتی وابستگی نہ ہو تو اس کا ترجمہ فنی اعتبار سے تو درست ہوسکتا ہے، لیکن اس میں حسن ادا کی کمی پائی جائے گی۔

اس کے برخلاف اگر موضوع مترجم کا پسندیدہ ہو اور اس سے وہ جذباتی وابستگی رکھتا ہو تو اس کے ترجمے میں جوش، روانی اور جذبات کی فراوانی بہ خوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہی حال اس کتاب کا بھی ہے۔ ڈاکٹر طارق ایوبی کی عالم اسلام کے حالات پر گہری نظر ہے۔ وہ اسلام کے نقیب اور ترجمان ہیں۔ کسی ملک میں اسلام پسندوں کو کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں اور کہیں ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ترکی کا قضیہ بھی ان کا اپنا قضیہ ہے۔ اس لیے اس کتاب کے ترجمے میں ان کے جذبات کی شمولیت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں عالم اسلام میں دو طرح کے ٹرینڈ چل رہے ہیں: ایک کے ترجمان ترکی کے صدر رجب طیب اردوان ہیں اور دوسرے کی ترجمانی سعودی عرب کے ولی عہد محمد بن سلمان کر رہے ہیں۔ اردوان اپنے ملک کی آزاد اور خود مختار پالیسی تشکیل دے رہے ہیں۔ وہ ترک عوام کو ملک کی تعمیر و ترقی میں برابر کا شریک دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ترکی کے تاریخی کردار کی بازیافت چاہتے ہیں۔ وہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے داعی اور اسلام کے علم بردار ہیں۔ اس لیے بڑی حکمت اور بصیرت کے ساتھ ایسے اقدامات کر رہے ہیں جن سے ملک میں اسلام کا بول بالا ہو۔ دوسری طرف محمد بن سلمان مغربی طاقتوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں اور وہی کچھ کر رہے ہیں جو ان کے مغربی آقا ان سے کرانا چاہتے ہیں۔ ان کے ذریعہ اسلام پسندوں کے لیے گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے اور اسلام دشمنوں سے محبت کی پینگیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ فلمی تھیٹر قائم کیے جا رہے ہیں اور رقص و سرور کی محفلیں سجائی جا رہی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اردوان اپنے ملک کو اسلام سے قریب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جب کہ محمد بن سلمان کی حرکتیں اپنے ملک کو اسلام سے دور لے جا رہی ہیں۔

سعودی عرب کی یہ صورت حال اسلام پسندوں کے لیے تشویش کا باعث ہے، لیکن ہمارے ملک کا ایک طبقہ سعودی عرب کی 'اندھ بھکتی' میں مبتلا ہے۔ ان حضرات کے دلوں میں سعودی عرب کے غیر اسلامی اقدامات پر کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوتا، لیکن ترکی کی ترقی، خود اعتمادی، اسلام پسندی، دینی غیرت و حمیت، مغربی ممالک سے پنجہ آزمائی اور دیگر ممالک کے مسلمان مظلوموں کی حمایت انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ اردوان کو 'امیر المومنین' کا طعنہ دیتے ہیں، ان کے اسلامی اقدامات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں خامیاں تلاش کر کے انھیں نمایاں کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ان بیچاروں کو نہیں معلوم کہ سعودی عرب مدت سے اسلام کا گہوارہ رہا ہے۔ وہاں بے دینی اور فحاشی عام کرنے کا چھوٹے سے چھوٹا اقدام لائق مذمت ہے، جب کہ ترکی میں گزشتہ سو سال سے اسلام پر سخت ترین پابندیاں عائد رہی ہیں اور عریانی، فحاشی، بدکاری، شراب نوشی اور دیگر برائیوں کی کھلی چھوٹ رہی ہے، اس لیے اگر وہاں اب بھی بہت سی برائیوں پر قابو نہیں پایا جا سکا ہے تو وہاں کے حکم راں اس پر سرزنش کے نہیں، بلکہ ہم دردی کے مستحق ہیں اور ان کی کم زوریوں کو سعودی عرب میں برائیوں کو فروغ دینے کے لیے وجہ جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کتاب میں مترجم نے اپنی تحریروں میں جا بجا اس پہلو پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور دینی غیرت و حمیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

اردو زبان میں یہ کتاب اپنے موضوع پر بروقت رہ نمائی فراہم کرتی ہے۔ یہ محض ایک شخص کی سوانح حیات نہیں ہے، بلکہ ایک ملک کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس میں ماضی کا تذکرہ ہے، حال کے اقدامات کا بیان ہے اور مستقبل کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے۔ ترکی کا تجربہ دیگر ممالک میں بھی دہرایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام پسندوں کے لیے رہ نمائی کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔ امید ہے، اس کتاب کو علمی و دینی حلقوں میں قبول عام حاصل ہوگا۔

☆☆☆